

جاسوسی دنیا

27- چار شکاری

28- بے گناہ مجرم

29- لاشوں کا آبشار



جاسوسی دنیا نمبر 29

لاشوں کا آبشار

(مکمل ناول)

پیش رس

”لاشوں کا آبخار“ ایک عظیم مصنف کی عظیم ترین تخلیق ہے! یہ وہ ناول ہے جس کا ہر لفظ، ہر جملہ اپنی جگہ پر نفسیاتی حقیقتوں کے ذخیرے رکھتا ہے۔ اس کے پورے ماحول میں ایک ایسی کشش اور جاذبیت ہے کہ ابتدا سے انتہا تک ہر کردار، کسی ڈرامہ کے افراد کی طرح ہنستا، بولتا، چیختا نظر آتا ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار کرنل فریدی اور حمید کے بجائے ایک مجرم ہے مگر ایسا مجرم جو سماج اور سوسائٹی کے لئے ہمیشہ سے ایک مسئلہ رہا ہے، ایسا عجیب و غریب سوال.... جس کا جواب اب تک نہ دیا جا سکا ہے!

اس ناول میں شاید ہی کوئی ایسا کردار ہو جسے آسانی سے بھلایا جاسکے! کنول کو آج تک لوگ یاد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُسے پھر موقع دیا جائے! حمید اور اس کی دلچسپ چھیڑ چھاڑ خصوصاً ابتدائی حصے میں اس کا برتاؤ قہقہہ انگیز ہے! نادرہ ایک مجہول سی لڑکی ہے جس کی شکل صرف ایک بار دکھائی دیتی ہے لیکن اس کی چال.... ذہن میں چپک کر رہ جاتی ہے۔ مسٹر

کیو جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے اپنی خوفناک آنکھوں سمیت ہر جگہ نظر آتا ہے۔

اس ناول کا وہ حصہ عجیب و غریب ہے جہاں مصنف نے پاگل خانے کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ تصویر اتنی مکمل، اتنی جاندار اور انسانی ہمدردی سے لبریز ہے کہ بے اختیار.... آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

حمید کے قہقہے اس کی شرارتیں، اس کے ہنسلے، اس کا حیرت انگیز ذہن جو بڑی سے بڑی مصیبتوں میں بھی قہقہے لگانے کے بارے میں سوچ سکتا ہے، ایک انوکھی دنیا کی تعمیر کرتے ہیں۔

اور پھر کرنل فریدی.... جیسا عظیم سراغ رساں اپنے کمال کے عروج پر نظر آتا ہے۔

پبلشر

الف لیلیٰ کی ایک رات

بلکی سردیوں کی ایک خوشگوار رات تھی لیکن یہ خوشگوار ہی اُسی وقت تک قائم رہی جب تک سر جنٹ حمید کو راستہ بھٹک جانے کا احساس نہیں ہوا۔ وہ سر شام ہی دلاورنگر سے چل پڑا تھا۔ کام کچھ اتنا ہی ضروری تھا کہ اس نے ٹرین کے وقت کا انتظار کرنے کے بجائے فریدی کی کار استعمال کی تھی۔ واپسی پر شام ہو گئی۔ تھوڑی دور تو وہ پختہ سڑک سے آیا پھر اس خیال سے کہ سفر مختصر ہو سکے اس نے ایک جگہ کار کو ایک کچے راستے پر موز دیا۔ یہ اس نے اپنی یادداشت کے بھروسے پر کیا تھا۔ اس کی دانست میں ایک بار فریدی نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ بہر حال حمید کو یقین تھا کہ اس نے کار غلط راستے پر نہیں موزی تھی۔

اُسے شہر پہنچنے کی کچھ اتنی جلدی تھی کہ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ کیڈ لاک جیسی شاندار گاڑیاں کچے راستوں کے لئے نہیں ہوتیں۔

مطلع غبار آلود ہونے کی وجہ سے چاندنی بلکی تھی اور جنگل کے سناٹے سے اس کی ہم آہنگی بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ حمید سوچ رہا تھا کہ اگر رفیق سفر تنہائی نہ ہوتی تو اس وقت کیڈی کے پیہوں کے نیچے کی نامہوار زمین نہ جانے کتنے جہانوں کی سیر کرا دیتی اس وسیع کائنات کے رشتے میں پروئے ہوئے دودلوں کے کتنے راز فاش ہوتے۔ اُس کے ذہن کی سطح پر کئی حسین چہرے ابھر آئے اور وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے گرد بکھری ہوئی بیکراں خوبصورتی کا ایک حصہ بنانے کے لئے منتخب کرنے لگا۔

بہر حال اس کا ذہن شاعرانہ خیالات کی وادیوں میں بھٹکتا رہا اور وہ خود جنگل میں جب کافی دیر ہو گئی اور وہ بدگد کا عظیم الشان درخت نہ ملا جہاں سے اسے بائیں طرف مڑنا تھا تو اچانک

وہ سارے شاعرانہ خیالات سرا سیمگی کی دلدل میں جا پھنسے۔ اس دوران میں نہ تو اسے وقت کا احساس رہ گیا تھا اور نہ یہی دھیان تھا کہ سڑک سے کتنا فاصلہ طے کر چکا ہے۔ کیڈی کے انجن سے کچھ اس قسم کی آوازیں نکلنے لگی تھیں جیسے پانی تھوڑا ہی رہ گیا ہو۔ پٹرول تو خیر ٹنکی میں کافی تھا اور کار کے پیچھے حصے میں بھی کئی ٹین بھرے رکھے تھے۔

اس نے کار روک دی لیکن انجن بند نہیں کیا۔ چند لمبے کچھ سوچتا رہا پھر کار اسی طرف موڑ دی جدھر سے آیا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر اسے دور راستے نظر آئے جو مختلف سمتوں میں چلے گئے تھے اور ان کے درمیان گھنا جھنگل تھا۔ حمید کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ وہ ان میں سے کس راستے سے آیا تھا۔ اس نے نیچے اتر کر پیہوں کے نشانات دیکھنے شروع کئے لیکن بد قسمتی سے زمین اتنی سخت تھی کہ وہ نشانات نہ ملنے پر اس میں سا بھی تو نہیں سکتا تھا اور آسمان تو خیر ازل سے ہی...

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ آخر کار اس نے جیب ٹٹول کر ایک روپیہ نکالا اور دونوں راہوں کو ذہن میں رکھ کر ناس کیا۔ روپیہ آواز کے ساتھ زمین پر گرنا اور وہ جھک کر دیکھنے لگا۔

”ہیڈ....!“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ اب وہ تن بہ تقدیر ایک راستے پر ہوا۔

کچھ دیر پہلے کی حسین چاندنی کفن یا کسی مقدس کنواری کی طرح بور لگنے لگی تھی۔ رو پہلی چادر اور سنائے کا ربط ٹوٹ چکا تھا۔ وہ حسین چہرے جو کچھ دیر قبل ذہن کی سطح پر ابھرے تھے جھلاہٹ کے غبار میں چھپ گئے اور وہ پختہ سڑک! وہ آدھ گھنٹہ چلتے رہنے کے باوجود بھی نہ ملی۔ کیڈی کا سنجیدہ ترین انجن پیاس سے بے قابو ہو کر شور مچانے لگا تھا۔

”شامت ہے شامت۔“ حمید نے بڑبڑا کر کیڈی روک دی۔

چند لمبے حس و حرکت بینچار ہا پھر نیچے اتر آیا۔

پانی کا مسئلہ بہت ضروری تھا اور نہ بھٹکنے کو کیا؟ دو چار گھنٹے اور سبھی لیکن پانی ہی کہاں مل جاتا۔ اگر وہ سڑک ہی سڑک چلا ہوتا تو کہیں نہ کہیں کامیابی ضرور ہو جاتی۔ آتے وقت راستے میں اس نے کئی تالات دیکھے تھے مگر یہاں جھنگل میں اگر کوئی ہوتا بھی تو ضروری نہیں کہ اس کی رسائی

اس تک ہو ہی جاتی۔

وہ کھڑا کچھ سوچ رہا تھا کہ دفعتاً اُسے اپنے سامنے کچھ دور پر روشنی دکھائی دی جو کچے راستے سے اٹھ کر سامنے کی جھاڑیوں پر پھیل گئی اور پھر ایک آواز سنائی دینے لگی جو کسی ٹرک ہی کے انجن کی ہو سکتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک تیز رفتار ٹرک جھاڑیوں سے نکل کر مخالف سمت میں مڑ گیا۔ حمید سوچنے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ٹرک ہی کی طرف سے آیا ہو۔

وہ پھر کیڑی میں جا بیٹھا اور اسی طرف بیل پڑا جدھر سے ٹرک آیا تھا۔

کچھ دور چلنے کے بعد اچانک اُسے پھر رک جانا پڑا۔ بائیں طرف ایک کشادہ راستہ تھا۔ نہ صرف ہموار بلکہ باقاعدہ دونوں طرف مالتی کی گھنی جھاڑیاں تھیں لیکن خود رو نہیں۔ ان کی کاٹ چھانٹ اور باقاعدگی کسی آدمی کی مرہون منت تھی۔ یہ راستہ ایک چھوٹے سے سلاخوں دار پھانک پر ختم ہو گیا تھا جو بند نہیں تھا۔ مدھم چاندنی میں ایک سفید سی عمارت کے آثار نظر آرہے تھے۔ حمید کو حیرت تو ضرور ہوئی لیکن کیڑی کے لئے پانی کی ضرورت نے اسے بڑھنے نہیں دیا۔ اس نے کار موڑی اور پھانک سے گذر کر پائیں باغ میں پہنچ گیا۔ جو اپنی وسعت کے اعتبار سے پائیں باغ سے بھی بڑی کوئی چیز تھی۔ جس کے درمیان میں ایک بڑی سی عمارت تھی لیکن طول و عرض کی مناسبت سے اس کی اونچائی غالباً بہت ہی کم تھی۔ سامنے ایک طویل برآمدہ تھا جس میں برقی قمقمے روشن تھے۔ قریب ہی کہیں سے گھڑ گھڑاہٹ کی آواز آرہی تھی جو غالباً کسی زیادہ طاقت والے ڈائنامو کی تھی۔

برآمدے کے سامنے والی روش پر مڑنے کی بجائے حمید نے کیڑی اسی طرف روک دی۔ برآمدے میں کوئی نہیں تھا اور آس پاس بھی کوئی نہ دکھائی دیا۔ حمید نے سوچا کہ اس جدید طرز کی عمارت میں جسے ڈائنامو کے ذریعے روشن کیا جاتا ہے گھنٹی ضرور ہوگی۔ وہ کیڑی سے اتر ہی رہا تھا کہ دفعتاً اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

اگر یہ تشبیہ گنہیا اور پرانی نہ ہوتی تو وہ یہی سوچتا کہ وہ چہرہ سیاہ پردے کی اوٹ سے اسی طرح نکلا تھا جیسے بدلی سے چاند نکل آئے سفید سلک کا لمبا لبادہ بلکورے لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور اس لبادے کے اوپر سیاہ بل کھائے ہوئے گیسوؤں میں ایک خوباناک اور سلگتا ہوا سا چہرہ جس کے خدو خال آنکھوں میں گدگدنی پیدا کر رہے تھے اور جب وہ برآمدے کی روشنی کی زد سے نکل کر

روش پر اتر آئی تو دھندلی چاندنی میں گویا جان پڑ گئی۔

وہ حمید سے ایک گز کے فاصلے پر کھڑی اس سے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی اور حمید کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے اپنے جسم کی مشین چلتے چلتے دفعتاً رک گئی ہو۔

”آپ کون ہیں؟“ تیز قسم کی سرگوشی سنائی اور حمید کو ایسا معلوم ہوا جیسے چاندنی بول اٹھی ہو۔

”مم... مسافر...!“ وہ ہکا بکا کر رہ گیا۔

”کیا چاہتے؟“ اس بار کھنٹیاں سی بج اٹھیں اور حمید یہ محسوس کئے بغیر نہ رہا کہ اس کی آواز میں بھی بڑی سیس اپیل ہے۔

”پانی...!“ حمید نے کینڈی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”ختم ہو گیا ہے۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کم سے کم الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کیوں کر رہا ہے۔

لڑکی واپس چلی گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ہولے ہولے ہو میں تیرتی چلی جا رہی ہو۔

حمید نے نصیب سے رومال نکال کر پسینے کی وہ بوندیں خشک کیں جو اس دوران میں اس کے

چہرے پر پھوٹ آئی تھیں۔ دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے وہ لڑکیوں کے معاملے میں بالکل

اناڑی ہی ہو۔ اس سے پہلے کبھی اسے کسی لڑکی کا قرب نہ نصیب ہوا ہو۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر برآمدے میں دکھائی دی اور اس نے حمید کو اشارے سے بلایا۔

حمید کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ برآمدے کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا

وہی لڑکی ہے جو کچھ دیر قبل اس کے قریب چاندنی میں کھڑی تھی؟ لباس تو وہی تھا لیکن شکل و

صورت کے معاملے میں اتنی اپنی یادداشت پر پورا پورا اعتماد تھا۔ یہ وہ لڑکی تو ہر گز نہیں تھی جو

کچھ دیر قبل اسکے حواس نمسہ پر بڑی طرح چھا گئی تھی۔ البتہ اس کی آنکھیں بھی خوابناک تھیں۔

”راستہ بھٹک گئے ہو۔“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ آواز میں اتنی دلکشی نہیں تھی۔

”جی ہاں... کیا آپ براہ مہربانی کارے لئے پانی دلوا سکیں گی۔“

”مجھے یقین نہیں آتا کہ تم آدمی ہو۔“ لڑکی نے تنبیہ کی سے کہا۔

”جی...؟“ حمید کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”سچ بتاؤ کیا تم آدمی ہو۔“ اس بار اس کی آواز شدت جذبات سے ٹپکپکار رہی تھی۔

”اس پر میں نے ابھی تک غور ہی نہیں کیا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”اگر پانی....!“

”آپ کھانا بھی میرے ہی ساتھ کھائیں گے۔“ لڑکی اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں نے شاید پچاس سال بعد آدمی دیکھا ہے۔“

یہ سن کر حمید کو بھی سنجیدہ ہو جانا پڑا۔ اس کے لئے یہ خیال بھی تو چین آمیز تھا کہ کوئی لڑکی اسے گھس رہی ہو۔

”تب تو آپ مجھے دیر تک دیکھئے۔“ حمید نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ لڑکی نے حمید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا۔

”ڈمباٹر....!“ حمید بولا۔ ”اور آپ کا۔“

”کنول؟“ اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ”میں ایک تالاب میں اُٹی تھی۔“

حمید بدقت تمام ہنسی ضبط کر کے بولا۔ ”اور.... میں.... مجھے کچھ شکاری مالیہ پہاڑ سے پلڑے لائے تھے۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔“

”ہمالیہ پہاڑ سے؟“ لڑکی نے پُر اشتیاق لہجے میں کہا۔ ”اندر چلو.... یا یہیں بیٹھ جاؤ۔“

حمید نے وہیں بیٹھنا زیادہ مناسب سمجھا۔

”ہاں تو تم کس طرح لائے گئے تھے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

حمید چند لمحے غور سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”کیا آپ کے والد صاحب گھر پر تشریف نہیں رکھتے۔“

”والد صاحب کیا ہوتا ہے؟“

”بہت بُرا ہوتا ہے۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”اگر گھر پر موجود ہو تو آپ جیسی صاحبزادیاں نیکی بلی بنی رہتی ہیں۔“

”بلی بھیک جانے پر اچھی نہیں لگتی۔“ وہ نفرت سے ہونٹ سکڑ کر بولی۔

”میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر آپ پانی دلوا دیتیں....!“

”پانی! اوہ.... کھانے کے بعد۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”تب تو آدمی نہیں معلوم ہوتے۔“ لڑکی نے مایوسی سے کہا۔

”اچھا مجھے بھوک ہے.... منگوائیئے کھانا۔“

”طاہوت.... او طاہوت۔“ لڑکی نے کسی کو آواز دی۔

حمید بے اختیار جھجک پڑا۔ سامنے والے دروازے سے ایک گرانڈیل حبشی جھپٹ کر باہر نکلا جس نے زمانہ قدیم کے حبشی غلاموں کا سلباس پہن رکھا تھا۔ وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

”کھانا یہیں لاؤ۔“ لڑکی نے اس سے کہا۔

حبشی کے جانے کے بعد حمید اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”طاہوت بڑا وفادار جانور ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”جب میں تالاب میں اُلی تھی تو یہ کوئے کی شکل میں کانیں کانیں کرتا ہوا میرے گرد منڈلانے لگا تھا۔“

حمید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں آپھنسا ہے۔ اس ویرانے میں اس قسم کی عمارت کی موجودگی ہی کم حیرت انگیز نہ تھی۔

”ہاں تو آپ ہمالیہ سے کس طرح لائے گئے تھے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”باندھ کر۔“ حمید بولا۔ ”اس وقت میرے پورے جسم پر ایک ایک فٹ لمبے بال تھے۔“

”بال! لیکن اب تو نہیں ہیں۔“

”وجہ یہ ہے کہ میں روز صبح اوپر سے نیچے تک شیو کر ڈالتا ہوں۔ سر پر تھوڑے سے بطور یادگار چھوڑ دیئے ہیں۔“

”اوہ....!“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر حمید بولا۔ ”اور وہ صاحبہ کہاں اُلی تھیں جو آپ سے پہلے مجھے ملی تھیں۔“

”کون؟ کیا یہاں؟“ لڑکی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”جی ہاں....!“

”لیکن یہاں تو میرے اور طاہوت کے علاوہ اور کوئی نہیں۔“

”تو پھر مجھے دھوکا ہوا ہو گا۔“ حمید نے اپروائی سے کہا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُسے لڑکی

کے بیان پر یقین نہیں آیا تھا۔ ہر چند کہ وہ اُسے شرارت ہی سمجھ رہا تھا پھر بھی اس مکان اور اس کے مکینوں کے متعلق کچھ معلوم کرنے کے لئے بے چین ہو گیا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ عمارت زیادہ پرانی نہیں ہے۔“ حمید پُر خیال انداز میں بولا۔

”ہاں! کل یہ کچھ تھی اور آج کچھ ہے۔ منٹوں میں بنتی اور بگڑتی ہے۔“ لڑکی نے کہا۔
 ”غالباً اس سلسلے میں کسی انگوٹھی یا چراغ سے مدد لی جاتی ہوگی۔“ حمید نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔
 ”اوہ....!“ وہ چونک کر حیرت سے بولی۔ ”تو آپ جانتے ہیں۔“
 ”کیا....؟“

”یہی کہ میں ایک جن کے قبضے میں ہوں۔“
 ”جی ہاں۔ میں نے آپ کے متعلق الف لیلا میں یہی پڑھا تھا۔“ حمید چڑ کر بولا۔ ”ویسے کیا میں آپ کے والد صاحب کا نام پوچھ سکتا ہوں۔“
 ”والد صاحب۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی۔ ”آخر یہ کیا بلا ہے؟“
 ”مجھے یقین ہے کہ اس وقت وہ بلا گھر میں موجود نہیں ہے۔“ حمید نے اوپری ہونٹ بھیجنے کر کہا۔
 ”آپ کچھ خفا معلوم ہوتے ہیں۔“
 ”مجھے جلدی ہے! اگر آپ پانی دلوادیتیں تو اچھا تھا۔ ویسے میں پھر کبھی بھی حاضر ہو سکتا ہوں۔“
 ”کیا میں اتنی بڑی ہوں۔“ لڑکی ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔
 ”آپ غلط سمجھیں مجھے جلد واپس جانا ہے۔“
 حمید کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ پاگل ہے۔
 ”طاوت.... او طاوت۔“ لڑکی نے حبشی کو آواز دی۔
 وہ پھر جھپٹ کر باہر نکلا۔
 ”کھانا لاؤ۔“

اس نے ایک میز اٹھا کر ان کے درمیان میں رکھ دی اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر واپس آیا۔ وہ اپنے ہاتھوں پر ایک بڑا سا خوان اٹھائے ہوئے تھا۔
 جیسے ہی خوان میز پر رکھا گیا حمید کے دیوتا کوچ کر گئے۔ خوان میں ایک بڑا سا سانپ کنڈلی مارے پھن اٹھائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں روشنی میں چمک رہی تھیں۔
 حمید نے بیٹھے ہی بیٹھے جست لگائی اور دوسرے لمے میں وہ برآمدے کے نیچے تھا۔
 ”پیارے.... میری جان۔“ لڑکی چیختی ہوئی جھپٹی۔

اُس نے حمید کو دبوچ لیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ ”یہ طاوت.... سو بڑا کمینہ ہے۔ تم ڈر گئے؟“

”نہیں....!“ حمید دانت بھیج کر بولا۔ ”شاید یہ پاگل خانہ ہے۔“
 ”دولت خانہ۔“ لڑکی نے سنجیدگی سے تصحیح کی۔

جبشی خوان اٹھا کر پھر اندر چلا گیا۔ وہ شروع سے اب تک مشین کی طرح حرکت کرتا آیا تھا۔ اس دوران میں ایک بار بھی اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ حمید سوچ رہا تھا کہ کیا وہ کسی جال میں پھنسنے والا ہے۔

”خفا ہو کر نہ جاؤ۔“ لڑکی نے اُسے برآمدے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔
 حمید کا شبہ حال تھا۔ نمہ بنی اور ندامت مٹیوں نے ایک ساتھ اس پر یلغار کر دی تھی۔
 لڑکی اُسے پھر برآمدے میں کھینچ لے گئی۔

”یہ طاوت.... واقعی بڑا کمینہ ہے میں معافی چاہتی ہوں۔“
 حمید حقیقتاً اس فکر میں تھا کہ کسی طرح نکل بھاگے۔
 ”تو آپ پانی....!“

”آج رات یہیں ٹھہر جاؤ تو کیا حرج ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔
 ”کیوں؟“

”آج وہ جن نہیں آئے گا۔“

”محترمہ! یہ بیسویں صدی ہے۔“ حمید اپنا اوپری ہونٹ بھیج کر بولا۔ ”آج کل کے لئے یہ شرارت بیکار ہے۔“

”شرارت! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“
 حمید نے سوچا کہ اس طرح سر مارنا فضول ہے۔ کیوں نہ وہ بھی انہیں خرافات پر اتر آئے۔
 لہذا وہ اپنے حرکات و سکنات میں ڈرامائی انداز پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔
 ”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ چاندنی نکل بھی اتنی ہی حسین تھی۔“ حمید کی آواز خوباناک تھی۔
 ”چاندنی....!“ لڑکی نے سسکی سی لی۔

”ایسی ہی چاندنی تو تھی جب میں۔“ حمید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”کیا؟“ لڑکی کی آنکھیں کچھ اور نشیلی ہو گئیں۔ حمید افق میں دیکھنے کی ایک نکتہ کر رہا تھا۔
 ”وہاں.... اس پار.... جہاں بہار کے خوش گلو پرندے.... طر بیہ گیت گاتے ہیں سنہری

اور شہدیلی خوبانیاں.... تمہیں شہدیلی پر اعتراض تو نہیں۔“
 ”نہیں! اعتراض کیوں ہوتا۔“

”میں سمجھا شاید تم اسے قواعد کے روستے غلط قرار دے دو۔“
 ”محبت کرنے والے قواعد لی پرواہ نہیں کرتے۔“ لڑکی تنبیہ گئی تے بولی اور حمید سوچنے لگا
 کہ شاید اب اتنی ڈھیٹ لڑکی سے کبھی ملاقات نہ ہو۔
 ”تو تم محبت کرنا چاہتی ہو۔“ حمید دردناک آواز میں کراہا۔ لیکن اس کی آواز دہلی دہلی سی تھی۔
 اسے اس کا بھی تو خیال تھا کہ اگر ابامیاں قسم کے کوئی بزرگ گھر پر موجود ہی ہوئے تو کیا ہو گا۔
 ”سچ سچ بتاؤ تم کون ہو۔“ لڑکی اُس کا ہاتھ دبا کر بولی۔
 ”ادھر چلو۔۔۔!“ حمید نے مالٹی کی جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ دونوں برآمدے سے اتر کر روش طے کر کے لان پر آئیٹھے۔ لڑکی سوالیہ انداز میں اُس کی
 طرف دیکھ رہی تھی۔

”میری داستان بہت درد بھری ہے۔“ حمید ایک آہ جگر خراش کھینچ کر بولا۔ ”اے منجھ دہن
 والے گل.... اندام میں رہنے والا شہر بے نیل و مرام کاہوں اور لوگ مجھے شہزادہ امرود بخت
 کہتے ہیں۔“

حمید نے محسوس کیا کہ وہ لڑکی ایک بے تحاشہ قسم کے قہقہے کو نہایت صفائی سے دبا گئی۔
 حمید بولتا رہا۔

”میرے باپ شہنشاہ شلہم نصیب نے مجھے پیدا کرنے کے سلسلے میں ایک خانہ باغ ترتیب دیا
 اور حسب دستور نجومیوں سے حکم لگوا دیا کہ بارہ برس تک عورتیں میری شکل نہ دیکھنے پائیں لیکن
 وائے پر حال شہنشاہ شلہم نصیب کہ جب میں پانچ ہی سال کا تھا تو ایک عورت نے مجھے اس طرح
 دیکھ لیا پس اُس دن سے یہ حال ہے کہ میں حمر احمر جنگل جنگل مارا پھر تاہوں۔ لہذا کبھی پڑول
 ختم اور کبھی پانی ختم۔ اس غریب الوطنی میں ایک بیہ سیمنی کے ایبٹ کے چدر میں پڑ کر کار بھی
 خریدنی پڑی۔“

حمید آہ سر د بھر کر خاموش ہو گیا۔
 ”کیا سوچنے لگ۔“ لڑکی تھوڑی دیر بعد بولی۔

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہیں اُس روسیہ جن کے بچے سے کس طرح چھڑاؤں۔“

”آہ میں اس نابکار خوک پیکر سے تنگ آگئی ہوں۔“

”ایک تدبیر ذہن میں آئی ہے۔“

”کیا؟“ لڑکی نے پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

”پتہ لگاؤ کہ اس نے اپنی زندگی کا بیمہ کرایا ہے یا نہیں۔“

”نہیں کرایا۔ میں پوچھ چکی ہوں۔“ لڑکی ایک بیساختہ قسم کی مسکراہٹ کو دبا کر بولی۔

”جب تو میں اُسے کسی بیمہ ایجنٹ کے چکر میں پھنسا کر تمہیں صاف نکال لے جاؤں گا۔“

”جج.....!“ لڑکی اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”ایک بار میں نے بھی اسی طرح اپنی جان بچائی تھی۔“

”کیسے؟ کیا بات تھی۔“

”اب سے ایک سال پہلے کی بات ہے۔“ حمید اپنے پائپ میں تمباکو بھرتا ہوا بولا۔ ”میں صحرا

صحرا پھر تا پھر اتا ایک شہر میں جا نکلا.... کہ نام جس کا نگار سلطانہ تھا۔ شہر پناہ کے پھانک پر میں

نے ایک جم غفیر دیکھا۔ بہت سے لوگ ایک گدھے کو پکڑے اس کی ناز برداریوں میں مصروف

تھے۔ جیسے ہی میں نے پھانک میں قدم رکھا گدھے نے دو لتیاں جھڑیں اور ان لوگوں سے چھوٹ

کر تیر کی طرح میری طرف آیا اور میری ناگوں میں سے اس طرح نکلا کہ میں دوسرے لمحے میں

اس کی پیٹھ پر سوار تھا۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں نعرے لگائے اور ٹوپیاں اچھالیں۔ پھر انہوں نے

مجھے گدھے پر سے اترنے نہ دیا اور مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے جلوس کی شکل میں آگے

بڑھے۔ میں نے ایک شخص سے کہ مرد عقیل و فہیم معلوم ہوتا تھا اس عزت افزائی کی وجہ پوچھی

تو اس نے کہا کہ ’جہاں پناہ بادشاہ بنا دیئے گئے‘۔“

”بادشاہ۔“ لڑکی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں! یہ اس ملک کی رسم تھی! جب بادشاہ مر جاتا تھا تو لوگ ایک گدھے کو پکڑ کر اسی طرح

بادشاہ کا انتخاب کیا کرتے تھے۔ گدھا جسے اپنے اوپر سوار کرالیتا وہی بادشاہ بنا دیا جاتا۔ اتنی بات تو

یقیناً بڑی اچھی تھی لیکن اس مرد عاقل نے ایک بات اور بھی بتائی جسے سن کر مجھے وجد کے عالم

میں گدھے سے اتر جانا پڑا۔“

حمید خاموش ہو کر پائپ سگاہنے لگا۔
 ”کیا بات تھی!“ لڑکی بے چینی سے بولی۔

”اس نے بتایا کہ مرتے وقت یہ گدھا بادشاہ پر سوار ہو جاتا ہے اور اس وقت تک نہیں اترتا جب تک اُس کا دم نہ نکل جائے۔ بہر حال میں نے گدھے سے اتر کر شور مچانا شروع کر دیا کہ گدھے کی آنکھیں کمزور معلوم ہوتی ہیں۔ مجمع نے کہا کہ شاہی گدھے کی توہین نہیں برداشت کی جاسکتی۔ تمہیں اس کی آنکھوں کی کمزوری کا ثبوت پیش کرنا پڑے گا۔ بات بڑھ گئی آخر فیصلہ یہ ہوا کہ گدھے کو کسی ماہر امراض چشم کے پاس لے جایا جائے۔ قندہ مختصر یہ کہ گدھے کی آنکھیں ٹسٹ کرائی گئیں اور واقعی وہ کمزور نکلیں۔۔۔۔۔ گدھے کے لئے چشمہ خریدا گیا۔ چشمہ لگتے ہی کمبخت نے پھر میری ہی طرف رخ کیا۔ میں نے پھر غل غپاڑہ مچایا کہ یہ نشے میں معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے گدھے کو پکڑ لیا۔ کیونکہ انتخاب کی ساعت ٹل چکی تھی۔ انہوں نے کہا کہ انتخاب کل ہوگا۔ لیکن گدھا تمہارے ہی ساتھ رہے گا۔ تو اسے نازنین پری تمثال وہ گدھا میرے پیچھے لگ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس طرح پیچھا چھڑاؤں۔ آخر ایک تدبیر سوچ گئی۔ میں نے کسی بیمہ کمپنی کے ایجنٹ کی تلاش شروع کر دی۔ تقدیر مہربان تھی کہ جلد ہی مل گیا۔ میں نے اس سے گدھے کا تعارف کرایا اور وہاں سے نوڈو گیارہ ہو گیا۔ پھر کافی رات گئے ایجنٹ کے ٹھکانے پر دوبارہ گیا۔ گدھا وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے وہ رات ایجنٹ ہی کے یہاں بسر کی اور رات بھر چین سے سونے کے لالچ میں میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں بھی اپنی زندگی کا بیمہ کراؤں گا۔ دوسرے دن صبح ہی صبح میں اسے اپنے ساتھ لے کر شہر پناہ کے پھانک پر پہنچ گیا۔ پہلے دن کی طرح آج بھی کافی بھیڑ تھی۔ گدھا چشمہ لگائے اداس کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو۔ جیسے ہی دونوں وہاں پہنچے وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ بیمہ کمپنی کے ایجنٹ نے لکھار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور اس پر نظر پڑتے ہی گدھے کا رخ پھر گیا۔ ایجنٹ اس کے پیچھے دوڑتا ہوا چیخ رہا تھا۔ سنئے تو سہی مسٹر۔ خدارا مستقبل کے لئے کچھ تو سوچئے۔ آپ کے چھوٹے چھوٹے بچے۔۔۔۔۔ آپ کے بوڑھے ماں باپ۔۔۔۔۔ آپ کی عزیز از جان رفیقہ حیات۔۔۔۔۔“ پھر گدھے نے کسی طرح جان نہ بچتی دیکھ کر ایک کنویں میں چھلانگ لگادی۔ اس طرح میں بادشاہ بشتہ بشتہ بچ گیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ گدھا کثرت سے برانڈی پیتا

تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔“

لڑکی بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ حمید نے اتنی دیر میں بناوٹ کا سارا جال توڑ دیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک ہنستی رہی پھر ایک سنجیدہ ہو گئی اور مضحل آواز میں بولی۔

”پیارے امرود بخت مجھے کسی طرح نکال لے چلو۔ ہائے یہ چاندنی رات اور اُس کا لے کلوٹے جن کا تصور بھی میرے لئے تکلیف دہ ہے۔“

”اگر تمہیں یقین ہے کہ اُس نے اپنی زندگی کا یہ نہ نہیں کرایا تو تمہیں اس قید سے رہائی دلا دوں گا۔ دوسری بات یہ کہ اب مجھے جانا چاہئے.... اور پانی۔“

”نہ جاؤ پیارے امرود بخت....!“ لڑکی ٹھٹھک کر بولی۔

”اف فوہ! مجھے یہ کمپنی کا ایک ایجنٹ بھی تو تلاش کرنا ہے۔“

”اچھا کھانا تو کھاؤ۔“

”بھئیے! اُس بار وہ طاوت کا بچہ....!“

”اوہو! تم سمجھے نہیں تھے۔ دراصل کھانا تیار نہ رہا ہو گا۔ اسی لئے اس نے جھلا کر یہ حرکت کی ہو گی۔“

”خیر! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ واقعی آپ کمال کی آدمی ہیں۔ جب بھی ادھر سے گزروں گا آپ سے ضرور ملوں گا۔ اب تو آپ سنجیدگی سے اپنا تعارف کروا دیجئے۔“

لڑکی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں سمجھی نہیں۔“

حمید نے سوچا اب اسے کچھ اور سمجھانا بیکار ہے۔ پھر کبھی سمجھا جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں برآمدے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ دونوں میں وہی پہلے والی بے

تکی گفتگو چھڑی ہوئی تھی۔ لیکن حمید سوچ رہا تھا کہ کھانے بہت لذیذ ہیں۔ خصوصاً شاہی نکلے

کھاتے وقت اسے سچے سچ نیند آنے لگی۔ باہر چاندنی کی خنک چادر پھیلی ہوئی تھی اور اس کی زبان پر

خوشبودار شاہی نکلے گل رہے تھے۔ آنکھوں کے پونوں میں گدگدی ہو رہی تھی اور ریزہ کی

ہڈی میں سرور انگیز لہریں تھیں اس کا دہنا ہاتھ تھپے سمیت اٹھایا رہ گیا اور اُسے گہری نیند آ گئی۔

آسمانی فائر

نہ جانے کب تک حمید پر وہ عجیب و غریب نیند طاری رہی۔

دوسرے دن.... اگر سورج کی کرنیں سیدھی اس کے چہرے پر نہ پڑتیں تو وہ سوتا ہی رہتا۔ بہر حال نیند کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ کیڑی ہی میں سفر کر رہا تھا لیکن کچھلی سیٹ پر لیٹے لیٹے وہ کھڑکڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ڈرائیو کرنے والے کی پشت اُس کی طرف تھی اور وہ انجینئر فریدی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

کچھلی رات کے سارے واقعات حمید کے ذہن میں چکر اکارتے تھے۔ اُس نے ایک بار پھر آنکھیں مل کر چاروں طرف دیکھا اور اُسے یقین آ گیا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہا ہے۔ ساتھ ہی فریدی کی آواز بھی سنائی دی۔

”آرام فرمائیے! آرام فرمائیے آپ اٹھ کیوں بیٹھے۔“

حمید نے جست لگائی اور اُس کے برابر پہنچ گیا۔ کیڑی شہر میں داخل ہو رہی تھی۔

”میں کہاں تھا؟“ حمید نے بے ساختہ پوچھا۔

فریدی نے اُسے گھور کر دیکھا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔“ حمید نے پھر کہا۔

فریدی اپنے ہونٹ بھیجنے خاموش رہا۔ حمید کی بوکھلاہٹ اور بڑھ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ

فریدی نے اُسے معلوم نہیں کہاں اور کس حال میں پایا ہو۔

”میں تمہارا تبادلہ کرا دینے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔“ فریدی تھوڑی دیر بعد بولا۔

”تبادلہ تو رات ہی کو ہو گیا ہو تا.... مگر....!“

”میں کوئی سڑی لمبی داستان یا اس حرکت کا جواز سننے کے لئے تیار نہیں۔“

”میں کہتا ہوں میری بات تو سنئے۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“

”اچھا تو یہی بتا دیجئے کہ میں آپ کو کہاں اور کس حال میں ملا تھا۔“

”حمید! بکواس مت کرو۔“

”بڑی مصیبت ہے۔“

وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ حمید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسے یقین تھا کہ فریدی اس کی داستان سن کر صرف قہقہے لگائے گا۔ یہ بھی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ بچپلی رات کو اسے بے وقوف بنایا گیا تھا۔ شاہی نکلنے کھاتے وقت طاری ہونے والی غنودگی اسے یاد تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا فریدی اسے اسی غمارت سے لایا ہے یا کہیں اور سے؟ کوٹھی پہنچ کر فریدی حمید کی طرف دیکھے بغیر اتر اور اندر چلا گیا۔ حمید چند منٹ بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر کینڈی گیراج میں لے جا کر کھڑی کر دی۔

فریدی اندرونی برآمدے میں ٹہل رہا تھا اور اس کا موڈ زیادہ خراب تھا۔ حمید چپ چاپ آکر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ فریدی نے ایک بار پھر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ حمید کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر فریدی نے اسے کہاں اور کس حال میں پایا تھا۔ وہ بھی اس کے کمرے میں چلا گیا۔

”بہتر یہی ہے کہ تم اس وقت کہیں ٹل جاؤ۔“ فریدی اس کی طرف مڑ کر بولا۔
 ”میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”میرا موڈ بہت خراب ہے۔“

”آپ تو اس طرح تاؤ کھا رہے ہیں جیسے میں آپ کی کنواڑی لڑکی ہوں۔“ حمید اوپری ہوٹ بھینچ کر بولا۔ ”اور آپ نے مجھے کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھ لیا ہو۔“
 فریدی پھر اسے گھورنے لگا۔

”اگر آپ فوراً ہی سیدھے نہ ہو گئے تو شاید آپ کو پچھتانا پڑے۔“ حمید نے کہا۔
 ”بک چلو۔“ فریدی۔ ”گار سنگاتا ہوا بولا۔“ ”لیکن تمہاری ان حرکتوں کی بناء پر مجھے بڑی ندامت ہوتی ہے۔“

”کن حرکتوں کی بناء پر؟“

”مجھے چڑھا رہے ہو؟“ فریدی تیز لہجے میں بولا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔“

”بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

”کیا ہمیشہ کے لئے۔“ حمید نے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔

”گٹ آؤٹ۔“

”میں کچھ نہیں کہتا۔“ حمید اٹھتا ہوا ہوا۔ ”اگر آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں تو بتا رہے ہیں لیکن اتنا تو بتادیتے کہ آپ نے مجھے کہاں اور کس حال میں پایا تھا۔“

فریدی اُسے غور سے دیکھ رہا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ حمید کے الفاظ کو تولنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”کیوں؟“ وہ آہستہ سے ہوا۔

”بات کچھ ایسی ہی ہے کہ جس پر آپ یقین نہیں کریں گے۔“

”ہوں!“ فریدی اپنے ہونٹ ہچکنچ کر رہ گیا۔

”میں اگلی سیٹ پر تھایا پچھلی پر۔“

”پچھلی پر.....!“

”اور کار کہاں تھی۔“

”سڑک کے کنارے۔“ فریدی تلخ لہجے میں ہوا۔

”سڑک کے کنارے۔“ حمید نے اپنی کھوپڑی پہلاتے ہوئے دہرایا۔

”اب کوئی ایسی داستان دہراؤ جس پر مجھے یقین آجائے۔“

”اُف فوہ! یہ تو میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ آپ یقین نہ کریں گے۔“

”ضرور یقین کروں گا۔ کیونکہ تمہارے ساتھ شہین کی دو خالی بوتلیں بھی تھیں۔“

”بوتلیں؟“ حمید آنکھیں پھاڑ کر ہوا۔

”چلو بور مت کرو! دفع ہو جاؤ۔“

”عجیب مصیبت ہے۔“

”جاؤ بابا جاؤ.... میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔ میں اب کسی بات کیلئے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”میں شاید جہنم سے بھی اسی طرح نکال دیا جاؤں۔“ حمید اپنے جیب میں پڑے ہوئے پائپ کو

ٹوٹاتا ہوا ہوا۔

”تمہارے ساتھ کون تھا۔“

”کیا کسی دوسرے کا سراغ بھی پایا جاتا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”آئینہ دیکھو.....!“ فریدی نے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

حمید کو اپنے گالوں پر لپ اسٹک کے وجہ نظر آئے۔

”میں سچ کہتا ہوں کہ آپ یقین نہ کریں گے۔“ حمید فریدی کی طرف مڑ کر بولا۔

”خیر آپ یقین کریں یا نہ کریں مجھے وہ داستان دہرائی ہی پڑے گی۔“ حمید نے کہا۔

اور پھر اس نے الف لیلیٰ والی داستان شروع کر دی۔ فریدی اپروائی سے سنتا رہا۔ نہ تو اُس ہنسی آئی اور نہ اُس نے کسی موقع پر حیرت ہی کا اظہار کیا جب حمید سب کچھ کہہ چکا تو فریدی کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔

”یہ کہانی بیسویں صدی کے معیار سے مطابقت نہیں رکھتی۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن شاید تم یہ

نہیں جانتے کہ وہ عمارت کس کی ہے؟“

”نہیں میں نہیں جانتا۔“

”اگر جانتے ہوتے تو اس سے کم از کم اس قسم کی کوئی داستان منسوب نہ کرتے۔“

”کیوں؟ وہ کس کی ہے۔“

”ڈاکٹر نارنگ ایم۔ پی۔ کی۔“

”ڈاکٹر نارنگ کی؟“ حمید کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ڈاکٹر نارنگ وہ پھر بڑ بڑایا۔

اُسے حقیقتاً حیرت تھی۔ ڈاکٹر نارنگ نہ صرف اُس شہر بلکہ پورے ملک کے مشہور ترین آدمیوں میں سے تھا۔ نہ صرف اعلیٰ حکام بلکہ وزراء تک اس کا احترام کرتے تھے۔ بہر حال حمید متحیر تھا کہ وہ اس ذرا سے کیا مطلب اخذ کرے جو پچھلی رات اس عمارت میں ٹھہرایا گیا تھا۔ حمید یہ بھی جانتا تھا کہ ڈاکٹر نارنگ غیر شادی شدہ تھا۔ لہذا یہ بھی نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ اس کی لڑکی رہی ہوگی۔

”کیوں؟ کیا سوچنے لگے؟“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اب اصل واقعہ بیان کر جاؤ۔“

”خدا کی قسم میں نے جو کچھ بھی کہا ہے اس میں ایک فیصدی بھی جھوٹ نہیں۔“

فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”خیر.....!“ حمید آہستہ سے بڑ بڑایا۔ ”میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ آپ یقین نہ کریں گے۔ مگر

وہ پہلی لڑکی.... وہ نہ جانے کون تھی اور کیا تھی۔ کتنی غیب تھی.... چال کتنی حیرت انگیز تھی۔“
 ”حیرت انگیز نہیں بلکہ قیامت کہو۔“ فریدی منہ بنا کر بولا۔ ”تمہاری بدولت مجھے کافی
 شرمندگی ہوئی ہے۔ پولیس کی ایک گشتی ااری لے کر تمہاری تلاش میں جانا پڑا اور تم جس حال
 میں ملے اس کا تو اس یہی تقاضا تھا کہ میں ڈوب مرتا۔“
 ”پھر آپ نے وہی بات کہی۔“ حمید جھنجھلا کر بولا۔ ”آپ کیوں ڈوب مرتے کیا میں آپ کی
 زوجہ محترمہ ہوں۔“

فریدی کو پھر غصہ آگیا اور حمید موقع کی نزاکت کا احساس کر کے اُس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔
 ”خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”ایک بار دیکھا ہے، اور دوسری بار
 دیکھنے کی ہوس ہے میں اسی عمارت کے قریب ہی کہیں ایک جھوپڑی ڈالنے والا ہوں۔“
 ”چھوڑو ختم کرو۔“ فریدی اکتا کر اٹھتا ہوا بولا۔ ”اب اگر تم نے کبھی بلا ضرورت شراب
 استعمال کی تو میں تمہیں دھکے دے کر نکال دوں گا۔“

”اس وقت ایشیا کا عظیم ترین سرانغ رساں بچوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔“ حمید نے ہونٹ
 سکوز کر کہا وہ فریدی پلٹ پڑا۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتا حمید پھر بولا۔ ”اگر میں آپ کو داؤر نگر
 کے قریب ہی کہیں ملا تھا تب تو یقیناً میں نے شہمپین کی دو بوتلیں صاف کر دی ہوں گی۔ غصہ
 خدا کا شہمپین کی دو بوتلیں اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔ کیا میں داؤر نگر کے قریب ہی ملا تھا۔“
 ”نہیں۔“ فریدی نے بیزاری سے کہا۔

”پھر کتنا فاصلہ رہا ہو گا۔“

”فضول وقت نہ برباد کرو۔“ فریدی اپروائی سے بولا حمید کے خیال دلانے پر وہ بھی اس
 مسئلے پر شبیدگی سے غور کرنے لگا تھا۔ حمید اسے داؤر نگر سے تقریباً پینتیس چالیس میل کے
 فاصلے پر ملا تھا۔ شہمپین کی دو بوتلیں صاف کر دینے کے بعد اتنی دور کا سفر شاید فواد کے آدمی سے
 بھی نہ ہو سکتا اور یہ چیز بھی تقریباً ناممکن تھی کہ حمید نے اتنا سفر کر چکنے کے بعد رک کر دو
 بوتلیں پی ڈالی ہوں۔ یہ بات فریدی بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ حمید شراب کا عادی نہیں ہے۔
 دوسری بات یہ کہ اگر کوئی عورت وہاں اس کے ساتھ آئی اور اسی کی ترغیب پر حمید نے یہ حرکت
 کر ڈالی تو پھر وہ خود کہاں گئی۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنی دور پیدل تو نہ گئی ہوگی۔

فریدی نے پھر حمید کی طرف دیکھا جو اس طرح ہونٹ سکڑے بیٹھا تھا جیسے سیٹی بجانے کا ارادہ کر رہا ہو۔

”آج تمہیں پاگل خانے میں داخل ہونا ہے۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”کیا...؟“ حمید بے ساختہ اچھل پڑا اور فریدی کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔
 ”پاگل.... خانے.... میں۔“ فریدی ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ ساجد حقیقتاً پاگل نہیں ہے۔“
 ”کون ساجد؟“

”کرئل فرید والا کیس بھول گئے۔“
 ”کرئل فرید۔“ حمید اپنے ذہن پر زور دیتا ہوا بولا۔
 ”چھ ماہ قبل کی بات ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”بھلا تمہیں کیوں یاد ہوگی۔ کرئل فرید جو پراسرار طریقے پر قتل کر دیا گیا تھا اور جس کی بہن غائب ہو گئی تھی۔“
 ”نہ جانے کتنوں کی بہنیں روزانہ غائب ہوتی رہتی ہیں۔ میں کہاں تک خیال رکھوں۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”تب پھر تمہیں اس کیس کی تفصیل کہاں یاد ہوگی۔ معاملہ تقریباً اب ہی گیا تھا۔ لیکن کل رات کو....!“
 دفعتاً ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ فریدی نے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو! فریدی بول رہا ہے.... ارے۔“
 فریدی کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ پڑا.... اور اس نے مضطربانہ انداز میں اُسے پھر اٹھایا۔ ”ہیلو.... ہیلو.... کہاں.... کیسے؟.... آتا ہوں۔“ وہ ریسیور رکھ کر تیزی سے حمید کی طرف مڑا۔

”چلو....؟“ وہ دروازے کی طرف بھاگا۔

حمید اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

گیران سے کار نکالتے وقت اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ حمید نے کبھی ات اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔

”کیا بات ہے۔“ اس نے گھٹی گھٹی سی آواز میں پوچھا۔

”وزیر خزانہ۔“ فریدی تھوک نکل کر بولا۔ ”وزیر خزانہ بھرے مجمع میں قتل کر دیئے گئے۔“

”بھرے مجمع میں۔“ حمید اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

کیڈیاک سڑک پر فراٹے بھرتی رہی اور وہ دونوں خاموش رہے۔ نہ تو حمید نے یہ پوچھا کہ یہ حادثہ کہاں ہوا اور نہ ہی فریدی نے بتایا۔ اس کی آنکھیں ونڈا سکرین پر جمی ہوئی تھیں اور ہاتھ اسٹیزنگ پر حرکت کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ اور بقیہ جسم قطعی بے جان معلوم ہوتا تھا۔ حمید کار میں لگے ہوئے آئینے میں دیکھ دیکھ کر اپنے چہرے سے لپ اسٹک کے دھبے صاف کر رہا تھا۔

”اپنے یہاں سے کس کس کی ڈیوٹی تھی۔“ حمید نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

”کئی انسپکٹر تھے، سپرنٹنڈنٹ بھی تھے۔ بڑی حیرت کی بات ہے۔ وزیر خزانہ کی مخالفت کہیں بھی نہیں تھی۔ نیک نام وزراء میں سے تھے۔“

”یہ حادثہ کہاں ہوا۔“

”یونیورسٹی میں.... وہ شعبہ فلکیات کا افتتاح کر رہے تھے۔ تفصیل نہیں معلوم ہو سکی۔“

”قاتل ضرور پکڑ لیا گیا ہوگا۔“ حمید بولا۔

”قاتل....!“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”کسی نے شاید قاتل کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔“

”کیوں....؟“ حمید چونک کر بولا۔

”میں اس وقت تمہیں یہی بتانے جا رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔“

”کیا؟“

فریدی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔

اگر کوئی اور موقع ہوتا تو حمید اس کی خاموشی پر جھنجھلا جاتا۔ لیکن خود اس کا ذہن اس بُری

طرح الجھ گیا تھا کہ اسے اپنے سوال کا دھیان تک نہ رہا۔

یونیورسٹی کی کیاؤنڈ پولیس والوں سے بھری تھی۔ ہر طرف سرخ پگڑیاں اور خاکی ٹوپیاں نظر آرہی تھیں۔ خصو صاً جلد گاہ جو کئی بڑے بڑے شامیانوں پر مشتمل تھی ٹیب افراتفری کا عالم تھا۔ فریدی اور حمید بھیڑ میں گھستے چلے گئے۔ ڈانس کے گرد پولیس آفسروں نے گھیر اڑال دیا تھا

ڈانس پر شہر کے اعلیٰ حکام اور کچھ معززین سرگوشیاں کر رہے تھے۔ انہیں میں فریدی کے محکمے کے آئی۔ جی اور ڈی۔ آئی۔ جی بھی تھے۔ ڈانس کے دابنے سرے پر ایک مذہبی پیشوا دعائیں پڑھ رہا تھا۔ فریدی کو دیکھ کر ڈی آئی جی نے اسے ڈانس پر آنے کا اشارہ کیا۔

گولی مقتول کی پیشانی پر لگی تھی۔ حمید نے لاش پر سے اپنی نظریں فوراً ہی ہٹالیں وہ اس بد بخت کے متعلق سوچ رہا تھا جس نے اتنے اچھے آدمی کو موت کی آغوش میں دھکیل دیا تھا۔ ملک میں ان کی علم دوستی اور خدا ترسی کی دھوم تھی۔ نہ جانے کتنے یتیم اور بیوائیں انہیں کے سہارے زندگی بسر کر رہی تھیں۔

فریدی تھوڑی دیر تک لاش کی طرف دیکھتا رہا پھر ڈی۔ آئی۔ جی اسے ڈانس کے نیچے اتار لے گیا۔ حمید بھی ساتھ تھا۔

”میں نے ہی تمہیں فون کیا تھا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی فریدی سے کہہ رہا تھا۔ ”اُف میرے خدایا؟ نہ جانے وہ کیا بلا تھی۔ میں یہیں موجود تھا۔۔۔ وہ تقریر کر رہے تھے۔“

”قاتل۔۔۔؟“ فریدی نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”کہاں کا قاتل، کیسا قاتل، نہ جانے وہ کیا چیز تھی۔ شکل تو رانگل جیسی نہیں تھی لیکن آواز ویسی ہی تھی۔“

فریدی پر خیال انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”فضا میں تیرتی ہوئی آئی تھی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی کہتا رہا۔ ”بس ایک لمحہ ڈانس کے سامنے معلق رہی اور آئر۔ بل منسٹر دوسرے لمحے میں نیچے تھے۔“

”اور وہ پھر اسی طرح واپس گئی جیسی آئی تھی؟“ فریدی نے کہا۔

ڈی۔ آئی۔ جی اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ”پھر میں نے تو دیکھا نہیں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ وہ تیر کی طرح اوپر چڑھتی چلی گئی۔۔۔ اور پھر نظروں سے غائب ہو گئی۔“

حمید سوچ رہا تھا کہ کیا فریدی پہلے ہی سے واقف تھا۔ اس کا یہ جملہ کہ کسی نے شاید قاتل کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔ اسی پر دلالت کرتا ہو معلوم ہو رہا تھا۔

”آئر۔ بل منسٹر تقریر کر رہے تھے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”ہاں انہوں نے تقریر شروع ہی کی تھی۔“

”مائیک سے کتنے فاصلے پر تھے۔“

”وہی جو فاصلہ ممو مار کھا جاتا ہے۔“

”مائیک کہاں گیا؟“ فریدی مضطربانہ انداز میں چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”مائیک بھی مائیک سے کیا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے بے دلی سے کہا۔ ”پتہ نہیں اس

افرا تقری میں کیا ہوا۔“

”میں مائیک کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے کسی کے حواس درست نہیں۔ تمہیں کیا الزام دوں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا اور

پھر ڈانس کی طرف چلا گیا۔

فریدی مجتہسانہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

”آخر مائیک کیوں۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

فریدی نے کوئی جواب نہ دیا وہ بھی ڈانس کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ڈانس پر کھڑے ہو کر

چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

”اوہ!“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ ڈانس سے اتر کر سیدھا اس طرف پہنچا

جہاں مائیکروفون کے لوازمات اکٹھا تھے۔ وہ چند لمحے اُن کا جائزہ لیتا رہا پھر حمید سے بولا۔

”تم یہیں ٹھہرو یہ ساری چیزیں روکی جائیں گی۔“

وہ پھر ڈی۔ آئی۔ جی کے پاس واپس آیا۔

”میں نے وہ سارا سامان رکوا دیا ہے؟“

”کون سا؟“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”مائیکروفون کے لوازمات۔“

”بھئی اس سے کیا ہو گا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی جھنجھلا کر بولا۔

”کیا وہ مشین اتنی بڑی تھی کہ اس میں کم از کم ایک آدمی بیٹھ سکے۔“ فریدی نے سوال کیا۔

”نہیں اتنی بڑی نہیں تھی۔“

”تب پھر مشینیں اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتیں۔ میٹرو کمپنی میں جہاں سے مائیکروفون آیا ہے

پہلی فرصت میں پہرہ لگانا چاہئے تاکہ کوئی چیز ادھر سے ادھر نہ ہونے پائے۔“

”اور....!“ ڈی۔ آئی۔ جی اُسے غور سے دیکھنے لگا۔
 ”جلدی کیجئے۔“ فریدی نے کہا اور بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

دوسرا حملہ

ایک گھنٹے کے اندر اندر پورا ملک سراسیمگی کا شکار ہو گیا تھا۔ اخبارات کے ضمیمے چھپ رہے تھے۔ شہر میں تو ایسا سناٹا تھا جیسے قبرستان ہو۔ دوکانیں بند تھیں۔ سڑکوں پر فوجی دستے گشت کر رہے تھے۔ راہ گیر سرگوشیوں میں گفتگو کرتے ادھر سے ادھر نکل جاتے اگر کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی آئی تو وہ دوسرے ہی لمحے میں چونک کر اس طرح سنجیدہ ہو جاتا جیسے اس سے یہ کسی لاش کے سر بانے سر زد ہوئی ہو۔

وزیر خزانہ بہت اچھے آدمی تھے اور جب کوئی بہت اچھا آدمی قتل کر دیا جاتا ہے تو کائنات کا ذرہ ذرہ سو گوار معلوم ہونے لگتا ہے۔ ہوائیں تک آئیں بھرنے لگتی ہیں۔
 عام آدمیوں سے زیادہ وہ لوگ پریشان تھے جن کی ذمہ داری مقتول کی جلسہ گاہ سے صحیح و سلامت واپس جانے ہی پر ختم ہو سکتی تھی۔ محکمہ سرانجام رسانی کی عمارت کے بڑے کمرے میں وہ سب اکٹھا تھے۔

آئی۔ جی کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور اس کے گرد بیٹھے ہوئے دوسرے آفیسر ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ چند لمحے پیشتر ان کے درمیان.... گرما گرم بحثیں ہوئی تھیں اور کچھ فیصلہ ہوئے بغیر ختم بھی ہو گئیں تھیں۔

اُس آسمانی رانفل کا مسئلہ اتنا آسان نہیں تھا کہ چند گفتگوں کی نشست میں اس کی تہہ تک پہنچا جاسکتا۔ اس کے متعلق تو اتنا بھی نہیں معلوم ہو۔ کا تھا کہ وہ آئی کس سمت سے تھی اور کس کس سمت۔ دیکھنے والے صرف اتنا بتا سکتے تھے کہ وہ ایک لمبے اور لمبائی کی مناسبت سے بہت ہی کم چوڑے صندوق کی شکل کی تھی۔ فائبر کی آواز ایسی ہی تھی جیسی کسی رانفل کی ہوتی ہے۔

انسپکٹر آصف انسپکٹر ماتھر کی طرف جھکا ہوا آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ”شرالاک ہومز کے نتیجے صاحب ندارد ہیں۔ خواہ مخواہ میٹرو والوں کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ میرے شیر کی ہر بات نرالی ہوتی

ہے۔ بھلامائیکروفون سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔“

انسپکٹر ماتھر کوئی جواب دینے کے بجائے دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ آئی۔ جی اپنی بھاری کھرکھراتی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”یہ درست ہے کہ اس آسمانی حربے کے سامنے سبھی بے بس تھے لیکن سوال تو یہ ہے کہ کسی ایسے حربے کا وجود ہی کیوں! آخر ہم سب کس لئے ہیں۔ مجھے اپنے محکمے پر فخر تھا۔“

کوئی کچھ نہ بولا۔ سب کو جیسے سانپ سو نگھ گیا ہو۔

”مجھے سب سے زیادہ شکایت تم سے ہے۔“ آئی۔ جی کی آواز پھر سنائی دی۔

اور ان سب کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں کیونکہ آئی۔ جی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ دروازے میں انسپکٹر فریدی دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے سرجنٹ حمید تھا۔ دونوں کے چہروں سے تھکن کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں کچھ نہ کر سکا۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ حمید کے رینک کا کوئی آدمی میننگ میں موجود نہیں تھا۔ اس لئے وہ اپنے پاؤں واپس چلا گیا۔

”مائیکروفون کا کیا قصہ تھا؟“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”ایک خیال پیدا ہوا تھا۔ لیکن فی الحال کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ ویسے میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ اس حادثے کا کچھ نہ کچھ تعلق مائیکروفون سے ضرور ہے۔“

”کیوں؟“

”ابھی سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی کہ مشینیں آدمی کی قوت ارادی کی پابند ہو جائیں۔ وہ مشین کسی میکاکی ہی سسٹم کے تحت چلتی ہوں گی۔“

فریدی خاموش ہو گیا۔

”ٹھیک ہے! کہتے جاؤ۔“ آئی۔ جی بولا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں۔ وہ یقیناً وائرلس ہی سے کنٹرول کی جاتی ہو گی۔“

”اور اس میں ٹیلی ویژن سسٹم کا بھی دخل معلوم ہوتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”اسی لئے میں مائیک پر زور دے رہا ہوں۔“

”کیوں؟“

”اگر ہم یہ نہیں تسلیم کرتے تو پھر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ وہ کسی آدمی کی قوت ارادی ہی کی پابند ہے۔ اسے چلانے والے نے سوچ لیا کہ آنرہیل منسٹر کو ختم کرنا ہے۔ لہذا وہ مشین ان لی تلاش میں چل پڑی۔“

آئی۔ جی کچھ نہ بولا۔ شاید اسے فریدی کا لہجہ ناگوار گزرا تھا۔

”شاید آپ کو وہ اڑن ہم یاد نہیں۔“ انسپکٹر آصف فریدی کو مخاطب کر کے بولا۔ ”جو کچیل جنگ عظیم میں جرمنوں نے استعمال کئے تھے۔“

”اڑن ہم....!“ آئی۔ جی آصف کو گھورنے لگا۔ ”ان کا یہاں کیا سوال؟“

”اڑن بموں کا سسٹم دوسرا تھا۔“ فریدی نے آصف کو مخاطب کیا۔ ”ان کی اڑان اور عمل میں سمت اور فاصلے کے تعین کو دخل تھا۔ اس لئے وہ بعض اوقات غلط جگہوں پر بھی گر پڑتے ہیں۔ فرض کیجئے وہ برلن سے لندن کے لئے روانہ ہو گئے تو وہ ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے لندن نہیں پہنچیں گے۔ انہیں کنٹرول کرنے والی مشین انہیں لندن کی سمت برلن اور لندن کے درمیان فاصلہ کا تعین کر کے روانہ کرے گی۔ بس اتنے ہی فاصلے پر پہنچ کر وہ گر جائیں گے چاہے وہ لندن ہو چاہے کوئی اور جگہ۔ سمت کے تعین میں ذرا سی بھی غلطی انہیں لندن کے بجائے کہیں اور پہنچا سکتی ہے۔“

”غیر متعلق بحث سے کیا فائدہ۔“ آئی۔ جی نے اُسے ٹوکا۔

”ہاں تو جناب والا میں یہ عرض کر رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ آنرہیل منسٹر کے گرتے ہی افراتفری کے دوران میں مائیکروفون بدل دیا گیا۔“

آئی۔ جی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”وہ شخص جو میٹرو کمپنی کی طرف سے مائیکروفون پر مامور تھا، حراست میں ہے۔“ فریدی پھر بولا۔ ”اس کے بیان سے معلوم ہوا ہے کہ جلسہ شروع ہونے سے آدھا گھنٹہ قبل مائیکروفون خراب ہو گیا تھا۔ اُس نے اُسے بنانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اتنے میں ایک آدمی نے یہ تجویز پیش کی کہ کمپنی سے دوسرا منگوا لیا جائے چونکہ مائیکروفون کی دیکھ بھال کرنے والا تنہا تھا اس لئے اس نے خود جانا مناسب نہ سمجھا۔ اس پر اس نامعلوم آدمی نے کہا کہ اُنروہ مائیکروفون کی طلبی کے لئے تحریر دے دے تو وہ منٹوں میں لا سکتا ہے۔ محاذ نے میجر کے نام ایک پرچہ لکھ کر

دے دیا اور وہ آدمی دوسرا مانیکرو فون لے آیا۔“

”اوہ...!“

”لیکن جلسہ گاہ میں بعد کو جو مانیکرو فون ملے۔ اُس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔“

”خاص بات؟“

”یعنی ان کا میلینیزم وہی تھا جو عام طور پر ہوتا ہے۔“

”اُس دوسرے آدمی کا پتہ چلا۔“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”جی نہیں! اس میٹرو کے فیچر کا بیان ہے کہ دوسرا کوئی مانیکرو فون جلسہ گاہ میں گیا ہی نہیں اور نہ اس صورت و شکل کا کوئی آدمی اس تک پہنچا تھا۔ دوسرا مانیکرو فون جو جلسہ گاہ میں ملا تھا اس کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ میٹرو کمپنی کا نہیں تھا۔ ویسے اس پر میٹرو کمپنی ہی کا نام درج تھا۔ میٹرو لاؤڈ اسپیکر سروس۔“

آئی۔ جی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

”حقیقتاً تم محکمے کی ناک ہو۔“

فریدی کے ساتھیوں کے منہ چڑھ گئے لیکن ڈی۔ آئی۔ جی بے اختیار مسکرا پڑا تھا۔ یہ مسکراہٹ کچھ ایسی ہی تھی جیسے کوئی باپ اپنے بچے کی تعریف کسی دوسرے سے سن کر کھل اٹھے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر آئی۔ جی نے کہا۔

”تو اب کیا کرنا چاہتے۔“

”ڈی۔ آئی۔ جی صاحب میرے طریقہ کار سے بخوبی واقف ہیں۔“ فریدی تھوڑے توقف

کے بعد بولا۔

اس پر ڈی۔ آئی۔ جی نے آئی۔ جی کی طرف جھک کر آہستہ سے کچھ کہا اور آئی۔ جی پر خیال

انداز میں سر بلانے لگا۔

کچھ دیر پورے کمرے میں سرگوشیاں ہوتیں رہیں پھر آئی۔ جی کی آواز سنائی دی۔

”بہر حال آپ لوگ اپنی آنکھیں کھلی رکھئے۔ یہ کیس خاص طور سے کسی کے سپرد نہیں کیا

جا رہا ہے۔ ہر ایک کو کوشش کرنی ہے۔“

اس مختصر سی ہدایت کے بعد میننگ درخواست ہو گئی۔ سب چلے گئے لیکن فریدی وہیں

موجود رہا۔

”اب بتاؤ۔“ ڈی۔ آئی۔ جی فریدی کی طرف مخاطب ہوا۔ آئی۔ جی کی نظریں بھی اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”میں نے پچھلی رات اس رائفل کو پرواز کرتے دیکھا تھا۔“ فریدی نے کہا۔

”کیا...؟“ دونوں بیک وقت بولے۔

”اور میرا خیال اُسی طرف گیا تھا۔“

”تو کیا تم پہلے ہی سے اس کے متعلق جانتے تھے۔“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”تھوڑا بہت۔“

”پھر بھی تم نے کچھ نہ کیا؟“

”کل رات سے قبل مجھے اُس کے وجود پر یقین نہیں تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”حقیقتاً کل رات

بھی مجھے یقین واثق نہیں تھا۔ اس کا تو اس وقت خیال آیا جب میں نے حادثے کی خبر سنی تھی۔“

”تم نے اُسے کہاں دیکھا تھا؟“

”شہر کے مغربی حصے میں وہ زیادہ بلندی پر نہیں تھی۔“

”مکہھر گئی تھی؟“

”مشرق کی سمت!“ فریدی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ لوگ اس کا امتحان کر رہے تھے۔“

”تو کیا تم ان لوگوں سے بھی واقف ہو۔“

”جی نہیں۔“

”بہر حال تم نے اپنی معلومات کو چھپا کر اچھا نہیں کیا۔“ آئی۔ جی کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔

”جناب والا... معلومات کی نوعیت ہی ایسی نہیں تھی کہ جس پر فوری ایکشن کیا جاسکتا۔“

”یعنی...!“

فریدی نے ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آپ کو کمرل فرید کا کیس تو یاد ہو گا۔“

”کمرل فرید۔“ ڈی۔ آئی۔ جی ذہن پر زور دیتا ہوا بولا۔ ”وہ جس کی بہن...!“

”جی ہاں! وہی...!“

”کیا کیس تھا؟“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”کرئل فرید! ایک ریٹائرڈ فوجی تھا۔“ فریدی بولا۔ ”دولت مند مگر شریف قسم کے لوگوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اب سے چھ ماہ قبل کسی نے اسے اس کی کونچھی ہی میں قتل کر دیا۔ اس کی بہن قتل والی رات ہی سے غائب ہے اس کا پرائیویٹ سیکریٹری اس حادثے کے بعد پاگل ہو گیا تھا جو آج بھی پاگل خانے میں ہے۔ بہن کرئل ہی کے ساتھ رہتی تھی۔“

”لیکن اس معاملے سے اس کا کیا تعلق...؟“ آئی۔ جی آلتا کر بولا۔

”وہی عرض کرنے جا رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”ایک ہفتہ قبل کی بات ہے کہ ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہوئی جو کرئل کے پرانے ساتھیوں میں سے تھا۔ دوران گفتگو میں اس سے پتہ چلا کہ کرئل ایک اچھا میکینک اور انجینئر بھی تھا۔ وائزلیس اور ٹیلی ویژن اس کے محبوب ترین موضوعات تھے اور وہ پچھلے کئی سالوں سے اس فکر میں تھا کہ انہیں کی بنیادوں پر کوئی حربہ تیار کرے اس وقت میں نے اس بیان کو کوئی اہمیت نہ دی تھی لیکن جب کچھلی رات پرواز کرتی ہوئی وہ شے مجھے نظر آئی تو قدرتی طور پر اس شخص کے الفاظ مجھے یاد آ گئے۔“

”کیس کا انچارج کون تھا؟“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”غالباً انسپکٹر سدھیر۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں اس زمانے میں گارساں والے معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ بہر حال کرئل کے قتل کی نہ تو آج تک وجہ معلوم ہو سکی اور نہ قاتل ہی کا سراغ ملا اور اس کی بہن کی حیرت انگیز روپوشی ابھی تک پردہ راز میں ہے۔ سدھیر کا خیال ہے کہ شاید وہ بھی قتل میں شریک تھی۔ لیکن میں واقعات کی روشنی میں ایسا سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ کرئل کا سیکریٹری پولیس کو ٹیب حالت میں ملا تھا۔ کرئل کی بہن کے بستر پر خون کے چھوٹے چھوٹے دھبے تھے اور وہ اس طرح بے ترتیب تھا کہ جیسے اس پر سونے والے کو کسی تہجد و جہد کرنی پڑی ہو۔“

”نو کر کہاں تھے۔“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”شاگرد پیشہ میں جو کونچھی سے کافی فاصلے پر ہے اور انہیں صبح ہی اس حادثے کی اطلاع ہوئی تھی۔“

”کچھ۔“ کا بھی اندازہ ہے کہ ان تمام معاملات میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

کافی دیر تک ان تینوں میں بحثیں ہوتی رہیں۔ لیکن آخر میں نتیجہ وہی صفر، نہ کوئی فیصلہ ہو سکا اور نہ طریق کار ہی کا تعین کیا جا سکا۔

فریدی کے دوسرے ساتھی مائیکروفون کے محافظ کے بتائے ہوئے حلیے سے چپے ہوئے تھے۔ وہ انہیں ریٹائرنگ روم میں چھوڑ کر مسکراتا ہوا باہر آ گیا۔

شہر کی حالت اب تک ویسی ہی تھی۔ ویرانی اور سوگواری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ فریدی کی کیڈیاک تیزی سے سڑک پر پھسل رہی تھی۔ حمید اور وہ خاموش تھے غالباً وہ دونوں اس سے بھی بے خبر تھے کہ ایک دوسری کار کیڈیاک کا تعاقب کر رہی ہے۔

”فی الحال ساجد ہی والی کڑی اپنے ہاتھ میں ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”کون ساجد۔“ حمید نے پوچھا۔

”وہی کرنل فرید کا سیکریٹری جو پاگل خانے میں ہے۔ اس سے کرنل کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ بنے ہوئے پاگلوں کو راہ راست پر انا بڑا دشوار کام ہے اور کرنل کی بہن کا سراغ! نہ تو اس کا کوئی فوٹو ہی دستیاب ہو سکا اور نہ مکمل حلیہ اگلے کے متعلق اختلاف بیانیایا پائی جاتی ہیں۔ البتہ ایک چیز سب کے بیانات میں مشترک ہے اور وہ ہے اس لڑکی کی چال۔ سب یہی کہتے ہیں کہ چلتے وقت وہ زمین سے کچھ اوپر تیرتی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے۔“

”کیا؟“ حمید بے ساختہ اچھل پڑا۔ لیکن اس کی حیرت ایک سیکنڈ بھی قائم نہ رہ سکی۔ کیونکہ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے کان کے قریب ہی ایک فائر ہوا ہو۔ دوسرے ہی لمحے میں فریدی کی چیخ سنائی دی اور حمید کے چہرے پر لاتعداد چھریاں سی آکر لگیں کیڈیاک ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

”یہ حادثہ ایک سنسان سڑک پر ہوا تھا۔ دو ایک لوگ جو ادھر سے گذر رہے تھے فریدی کی کار کی طرف جھپٹے۔ فریدی اپنی پیشانی دبائے حمید پر جھکا ہوا تھا۔ جس کا سر سیٹ کی پشت سے ٹک کر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ حمید کے چہرے پر کئی جگہ خون رس رہا تھا اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ فریدی نے اسے سنبھالنے کے لئے اپنی پیشانی سے ہاتھ بنالیا اور اس کے چہرے پر بھی خون کی چادر پھیل گئی۔

”ٹھہرے۔ ٹھہرے۔“ ایک راگبیر اس کی مدد کے لئے لپکا۔ چار پانچ آدمی کار کے گرد انہما

ہو گئے تھے۔

کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہو گیا تھا۔

فریدی نے اطمینان کا سانس لیا۔ حمید کے گولی نہیں لگی تھی۔ کھڑکی کے شیشے کے ٹکڑوں نے اس کا چہرہ زخمی کر دیا تھا اور خود فریدی کی پیشانی کا زخم بھی انہیں ٹکڑوں کے لگنے کا نتیجہ تھا۔

اس نے رومال سے اپنا چہرہ صاف کیا اور راگیئر سے بوا۔

”ٹھیک ہے! سب ٹھیک ہے۔“

”کسی نے اس پٹی کار سے گولی چلائی تھی۔“ دوسرے نے کہا۔ ”میں نے خود دیکھا تھا۔ یہ کیا

آفت آگئی ہے اس شہر میں۔“

”گولی! نہیں کسی شہریرے نے پتھر پھینکا تھا۔“ فریدی مسکرا کر بوا۔

”کمال کرتے ہیں آپ ارے جناب میں نے خود دیکھا تھا۔“

”آپ کو دھوکا ہوا ہو گا۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

راگیئر حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

کیڈیاک سول ہسپتال کی طرف جا رہی تھی۔

حمید تھوڑی دیر بعد کسمسایا اور کراہ کر سیدھا ہو گیا۔ سامنے لگے ہوئے آئینے پر نظر پڑتے ہی

ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کا سارا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”چھوٹا مت۔“ فریدی آہستہ سے بوا۔ ”گھبراؤ نہیں زخم گہرے نہیں ہیں۔ ننھی ننھی

کرچیں معلوم ہوتی ہیں۔“

”اوہ آپ بھی تو۔“

”میری فکر مت کرو۔“ فریدی مسکرا کر بوا۔ ”بس نقدیر ہی تھی۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ گولی میرے

دائے شانے کو چھوتی ہوئی نکل گئی ہے۔ اگر کوٹ میں شو لڈر پیڈ نہ ہوتا، تو ہڈی صاف تھی۔ البتہ

پچھلی سیٹ برباد ہونے کا افسوس ہے۔“

حمید نے پلٹ کر دیکھا۔ پچھلی سیٹ میں بڑا سا سوراخ تھا۔

”تو کیا وہی رائفل تھی۔“ حمید بوکھلا کر بوا۔

”نہیں گولی ایک کار سے چلائی گئی تھی۔“

”کار سے۔“

”ہاں اور وہ شخص تمہاری وجہ سے نکل گئی۔ میں سمجھا شاید تم اللہ کو پیارے ہو گئے۔“

”کاش گولی میرے ہی لگی ہوتی۔“ حمید ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ”اب میرے چہرے پر بے شمار رنگ کے داغ ہوں گے اور کوئی لڑکی میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرے گی۔“

”لڑکی....!“ فریدی نے منہ بنا کر کہا اور اپنا نچٹا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔

”ہائے۔“ حمید آہستہ سے کراہا۔

”میں نے مائیکروفون کے معاملے میں بلز مچا کر غلطی کی تھی۔“ فریدی بولا۔

پُر اسرار مسٹر کیو

اُس حیرت انگیز رائفل کے متعلق نہ صرف شہر یا ملک بلکہ ساری دنیا میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ خصوصاً شہر کے لوگ تو بڑی طرح سبے ہوئے تھے۔ ملک کی سربراہ اور وہ ہستیاں خوف اور اندیشوں کا شکار ہو گئی تھیں۔

دوسرے دن کے اخبار نے وزیر خزانہ کے قتل کے ساتھ ہی محکمہ سراغ رسانی کے دو بہترین افراد پر حملے کی بھی خبر چھاپی تھی۔ اخبار بیچنے والے گلی کوچوں میں چیختے پھر رہے تھے۔

”محکمہ سراغ رسانی کے دو آفیسروں پر بھی قاتلانہ حملہ، دونوں آفیسر اپنے زخموں کی ڈریسنگ کرانے کے بعد حیرت انگیز طریقے پر غائب ہو گئے۔“

یہ فریدی اور حمید کے زخمی اور غائب ہونے کی خبر تھی۔ انہوں نے سول ہسپتال میں اپنے زخموں کی ڈریسنگ کرائی تھی اور پھر اپنے محکمے کے اعلیٰ آفیسروں کو اطلاع دینے بغیر روپوش ہو گئے تھے۔ اخبارات کی اطلاع تو دراصل یہی تھی لیکن عام آدمی اسے کیا سمجھتے کہ اسی دن محکمہ سراغ رسانی کے ڈی۔ آئی۔ جی کی کارروائی اور نگر کی طرف کیوں جاری تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ اور دو انسپکٹر بھی تھے۔ ڈی۔ آئی۔ جی خود کارڈرائیو رہ رہا تھا۔ پینتیس میل پختہ سڑک پر چلنے کے بعد کار ایک کپے راستے پر مڑ گئی۔ پھر وہ اُس عمارت میں داخل ہوتی دکھائی دی جس میں سر جنٹ حمید نے ایک حیرت انگیز رات گزاری تھی۔

ڈائریکٹ ایم۔ پی عمارت میں موجود تھا۔ اُسے محکمہ سراغ رسانی کے آفیسروں کو اپنی دہشت میں دیکھ کر حیرت نہ ہوئی کیونکہ وہ مقتول مسٹر کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔

ڈاکٹر نارنگ دوہرے بدن کا ایک لمبا ترنگا آدمی تھا۔ عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان میں رہی ہوگی۔ لیکن صحت مند ہونے کی بناء پر یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ بڑھاپے کی سرحدوں میں قدم رکھ چکا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ گھٹنگو کرنے کا عادی تھا اور دوران گفتگو میں اپنی نظریں مخاطب کے چہرے سے ہٹائے رکھتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اُسے کبھی کسی سے کرخت آواز میں گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا گیا۔

”میں اُن تمام لوگوں سے مل رہا ہوں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی کہہ رہا تھا۔ ”جن سے مقتول منسٹر کے قریبی تعلقات تھے۔“

”میں بھی انہی بد نصیبوں میں سے ایک ہوں۔“ ڈاکٹر نارنگ کی آواز کپکپا گئی۔

پھر ڈی۔ آئی۔ جی کافی دیر تک مقتول کے دوسرے دوستوں کے متعلق پوچھ پچھ کرتا رہا۔ اور جب واپسی کیلئے بالکل تیار تھا تو اُس نے اچانک ڈاکٹر نارنگ سے کہا۔ ”مجھے ایک شکایت بھی ہے۔“

”کہئے۔“ ڈاکٹر نارنگ نے میز پر رکھے ہوئے گلدان کی طرف نظر جماتے ہوئے کہا۔

”یہاں پر سوں رات کو میرے محلے کے ایک آدمی کے ساتھ بڑا خطرناک مذاق کیا گیا۔“

”یہاں....!“ ڈاکٹر نارنگ چونک پڑا۔ ”میں نہیں سمجھا۔“

”کسی صاحبزادی نے اُسے کوئی نشہ آور چیز کھلا دی تھی۔“

”صاحبزادی نے۔“ ڈاکٹر نارنگ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”جی ہاں، وہ راستہ بھٹک کر ادھر نکل آیا تھا۔“

”اُسے غلط فہمی ہو گئی ہوگی۔ یہ حادثہ کہیں اور پیش آیا ہوگا۔“

”اُسے یقین ہے؟“

”جب اس نے خواب ہی دیکھا ہوگا۔“ ڈاکٹر نارنگ مسکرا کر بولا۔ ”یہاں ہمیشہ اس عمارت کا منتظم چند نوکروں کے ساتھ رہتا ہے اور وہ بھی میری ہی طرح تجربہ کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ میں زیادہ تر شہر میں رہتا ہوں۔ کبھی کبھی ادھر بھی آ نکلتا ہوں۔ پر سوں میں یہاں نہیں تھا۔ یہاں کسی لڑکی کی موجودگی سرے ہی سے مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس طرف اس ساخت کی کوئی اور عمارت نہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔

”نہیں۔“

”اس نے بالکل یہی نقشہ بنایا تھا۔ جو میں اس عمارت کا دیکھ رہا ہوں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بولا۔
”مجھے حیرت ہے۔“

”اس نے ایک حبشی غلام کا بھی تذکرہ کیا تھا۔“

”حبشی غلام۔“ ڈاکٹر نارنگ بے ساختہ ہنس پڑا۔ ”تب تو اُس نے حقیقتاً خواب دیکھا ہو گا۔“
”دولڑکیاں تھیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی اس کی بات نظر انداز کر کے بولا۔ ”ان میں سے ایک تو ایسی تھی جسے ہم عرصہ سے تلاش کر رہے ہیں۔“

ڈاکٹر نارنگ یک بیک سنجیدہ ہو گیا اور پھر اس نے کسی کو آواز دی۔ چند لمحوں بعد ایک قبول صورت نوجوان اندر داخل ہوا۔ جس نے سمر کا سوٹ پہن رکھا تھا اور گردن میں شوخ رنگوں والی نائی تھی۔

”پرسوں رات کو یہاں کون تھا۔“ ڈاکٹر نارنگ نے اس سے پوچھا۔
”جج..... جی..... کوئی بھی تو نہیں.... کوئی نہیں۔“ منتظم ہکلانے لگا۔
”جھوٹ مت بولو۔“

”جی کوئی نہیں.... میں.... سس.... سچ....!“
”ہکلا کیوں رہے ہو.... کوئی ضرور تھا۔“ ڈاکٹر نارنگ کی آواز بلند ہو گئی اور سیکریٹری کا پنے لگا۔
”جج..... جی..... مم.... معافی چاہتا ہوں۔“
”کون تھا....؟“

”ڈائرکٹر ناگر....!“

”یہ کیا بلا ہے۔“

”فلم ڈائرکٹر، میرا دوست ہے۔ ادھر شوٹنگ کی غرض سے آیا تھا۔ میں نے آپ کی اجازت کے بغیر ٹھہرا لیا تھا۔ معافی چاہتا ہوں۔“

”کوئی حبشی بھی تھا ان کے ساتھ۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔
”جی ہاں۔“

”اور دولڑکیاں بھی۔“

”جی نہیں صرف ایک تھی کنول۔“

”کسی مسافر کو بیوقوف بنایا گیا تھا؟“ ڈاکٹر نارنگ نے پوچھا۔
 ”جی ہاں.... وہ کنول کی شرارت تھی.... میں منع کرتا رہا.... مگر؟“
 ”اُسے کوئی نشہ آور چیز دی گئی تھی۔“ نارنگ نے پوچھا۔
 ”نشہ آور.... اوہ.... شاید وہ اسی لئے سو گیا تھا۔“
 ”صاف صاف بتاؤ۔“

”اُسے بیوقوف بنانے کا پروگرام کنول ہی نے بنایا تھا۔“ منتظم نے کہا اور شروع سے آخر تک پوری داستان دہرانے کے بعد بولا۔ ”کنول اور حبشی کے علاوہ کوئی اور اُس کے سامنے نہیں گیا۔ پھر کنول نے اُسے کھانا کھلایا اور کھاتے ہی کھاتے وہ سو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کوئی نشہ آور چیز تھی۔ پھر ہم اُسے اسی کی کار میں ڈال کر سڑک پر چھوڑ آئے تھے۔“
 ”تم جانتے ہو کہ تم لوگوں نے کتنا بڑا جرم کیا ہے؟“ نارنگ بولا۔ ”اگر وہ سانپ اُسے کاٹ لیتا تو۔“
 ”جی.... دراصل اُس میں زہر نہیں تھا۔ ناگر اُسے کسی سین کی شوٹنگ کے لئے لایا تھا۔“
 ”لیکن کسی کو کوئی نشہ آور چیز کھلا دینا بھی جرم ہے۔“
 ”میں معافی چاہتا ہوں۔“ منتظم گڑگڑایا۔
 ”لڑکیاں دو تھیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔
 ”جی نہیں ایک تھی۔“

”تمہاری بدولت مجھے ذلت نصیب ہوئی۔“ ڈاکٹر نارنگ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا وہ ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف مڑ کر بولا۔ ”آپ اسے لے جائیے اور جو کاروائی مناسب سمجھئے کیجئے۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“

”میں معافی چاہتا ہوں۔“ منتظم پھر گڑگڑانے لگا۔
 ”دوسری لڑکی کون تھی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے گرج کر پوچھا۔
 ”جج.... جی.... دوسری لڑکی.... مم.... ناگر کی محبوبہ تھی۔“
 ”تم نے اب تک اُسے چھپایا کیوں تھا۔“
 ”وہ.... نن.... ناگر....!“

”گھبراؤ نہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نرم لہجے میں بولا۔ ”میں نارنگ جی کی بدنامی کے خیال سے

تمہیں درمیان میں نہ لاؤں گا۔“

منتظم تھوڑی دیر تک سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر تھوک نگل کر بولا۔ ”پہلے وہی لڑکی باہر آئی تھی پھر اُس نے اندر جا کر اُس مسافر کا تذکرہ کیا۔ ناگزیر اندر تھا اس نے جھانک کر باہر دیکھا اور کنول سے تھوڑی دیر تک سر گوشیاں کرتا رہا۔ پھر اُس نے کنول کو باہر بھیج کر اس لڑکی کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ وہ مسافر دراصل ایک ایسا رئیس ہے جو اس کی محبوبہ پر ڈورے ڈالنے کی فکر کر رہا ہے۔۔۔۔۔ وہ اُسے اچھی طرح بیوقوف بنا کر رخصت کرے گا۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس لڑکی کا تذکرہ کسی سے نہ کروں یونہی۔ وہ اسے بعض پروڈیوسروں سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”تمہیں اس لڑکی سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔“

”جی نہیں وہ بہت کم گفتگو کرتی تھی اور اس کی آنکھوں۔۔۔۔۔!“

”ہاں ہاں کہو! نکیر او نہیں۔“

”اس کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بیداری میں بھی کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔“

”تم ناگزیر کو کب سے جانتے ہو۔“

”پچھلے ماہ اس سے شہر میں ملاقات ہوئی تھی۔“

”یہاں پہلی بار آیا تھا۔“

”نہیں دوسری بار۔ اس سے پہلے بھی اس نے یہاں دو تین دن تک قیام کیا تھا۔ لیکن اس

وقت وہ اکیلا ہی تھا۔“

”اس کا پتہ۔“

”سولہ پرنس اسکوائر۔۔۔۔۔ دولت گنج۔“

”سپرٹنڈنٹ نے پتہ نوٹ کیا اور ڈی۔ آئی۔ جی نے ہاتھ کے اشارے سے گفتگو کا سلسلہ ختم

کر دیا۔“

”جاؤ۔۔۔۔۔!“ ڈاکٹر نارنگ سیکریٹری کو گھورتا رہا۔ پھر ڈی۔ آئی۔ جی بولا۔ ”مجھے اس واقعے پر

افسوس ہے۔“

”اب بہتر یہی ہے کہ تم اپنا بستر گول کرو۔“

”حضور میں تباہ ہو جاؤں گا۔“ منتظم گڑ گڑایا۔

”تمہیں بیس منٹ کے اندر اندر کوٹھی چھوڑ دینی ہے۔“ ڈاکٹر نارنگ نے خشک لہجے میں کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

منتظم اس کے عادت و اطوار سے اچھی طرح واقف تھا اور اس لہجے کو خوب سمجھتا تھا۔ چارہ ناچار اس نے اپنی ضروری چیزیں ایک سوٹ کیس میں بھریں اور باہر نکل آیا۔ ڈاکٹر نارنگ مالتی کی جھانڑیوں کے قریب آم کے درخت کے سائے میں کھڑا تھا۔ اس نے منتظم کو جاتے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

سوٹ کیس وزنی تھا۔ کبھی وہ اُسے ہاتھ میں لٹکاتا اور کبھی کاندھے پر رکھ لیتا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سوچتا جا رہا تھا کہ کب تک اور کہاں تک اس طرح جائے گا۔

کچے راستے کے دوسرے موڑ تک پہنچتے پہنچتے اس کے دونوں ہاتھ شانوں سے علیحدہ ہوتے معلوم ہونے لگے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح وہ پختہ سڑک تک پہنچ ہی گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کدھر جائے۔

دفعۂ سمت مخالف سے ایک کار آتی دکھائی دی۔ چونکہ ونڈاسکرین سورج کے سامنے نہیں تھا اس لئے کار ڈرائیو کرنے والے کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی اور وہ ہاتھ اٹھا کر چیخا۔ ”ناگر....!“

کار اس کے قریب آ کر رک گئی۔

”ہیلو راجن.... کہاں؟“ کار ڈرائیو کرنے والے نے کہا۔

”ارے یار کیا بتاؤں.... شاید اس وقت پیدل ہی شہر جانا پڑتا۔“

”بھلا کیوں؟ چلو سوٹ کیس اندر رکھ دو۔“

راجن نے پچھلی سیٹ کی کھڑکی کھول کر سوٹ کیس رکھ دیا۔ اب اس نے دیکھا کہ پچھلی سیٹ پر ایک آدمی اور بھی تھا۔ اس نے مسکرا کر سوٹ کیس رکھوانے میں مدد دی۔ راجن کے لئے صورت نئی تھی۔

”ادھر آ جاؤ۔“ ناگر نے اگلی سیٹ کی کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔

راجن بیٹھ گیا اور کار چل پڑی۔ رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

”پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔“ راجن ہانپتا ہوا بولا۔ ”تمہاری ہی وجہ سے مجھے ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ میں تمہیں منع کر رہا تھا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی تھی۔ وہ آدمی دراصل محکمہ سرانگ رسانی کا کوئی آفیسر تھا۔ یار سچ بتاؤ وہ لڑکی کون تھی۔“

ناگر ہنسنے لگا۔ ”پرواہ مت کرو پیارے۔ میرا بہت بڑا.... کاروبار ہے۔“
 ”مگر.... میں نے پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ البتہ تمہارا پتہ بتاتے وقت مجھے ہوش آگیا تھا.... اور میں نے صحیح پتہ نہیں بتایا۔“

”کسی بات کی فکر مت کرو۔“ ناگر گردن جھٹک کر بولا۔

”سچ بتاؤ، وہ لڑکی کون ہے۔“

”میری محبوبہ! میں اُسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔“

”نہیں سے بھگا کر لائے ہو۔“

”ہاں....!“ ناگر نے کہا اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔

کارایک کچے راستے پر مڑ گئی۔

”ادھر کہاں؟“ راجن نے پوچھا۔

”جلد پہنچیں گے کم از کم دس میل کا فرق پڑ جائے گا۔“

راستہ آٹھ دس فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ دونوں طرف سرکنڈوں کی اونچی اونچی اور گھنی جھاڑیاں تھیں۔

”اور کیا پوچھا تھا پولیس والوں نے۔“

”اور تو کچھ بھی نہیں لیکن حیرت ہے کہ انہوں نے مجھے اس خیال سے گرفتار نہیں کیا کہ

اس میں ڈاکٹر نارنگ کی بدنامی تھی اور ڈاکٹر نارنگ نے مجھے اس طرح نکال دیا۔“

”فی الحال تم شہر میں کہاں جاتے۔“ ناگر نے پوچھا۔ ”کیا کوئی تمہارا دوست یا عزیز وہاں ہے۔“

”کوئی نہیں! میں تمہارے ہی پاس جاتا اور پھر کوئی اور انتظام کرتا۔“

ناگر نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر راجن بولا۔

”یار وہ کنول بڑی تیز لڑکی ہے۔“

”کیوں.... کہیں عاشق تو نہیں ہو گئے اس پر۔“ ناگر نے بھداسا قہقہہ لگایا۔

کی طرف اچھا ل دی۔ دوسرے ہی لمحے میں وہاں آگ ہی آگ تھی۔ واپسی پر انہیں کار میں ایک پرچہ ملا جس پر تحریر تھا ”اپنے کام سے کام رکھو! اور حکم کی تعمیل کرو! مسٹر کیو کے متعلق کچھ سوچنا موت کو دعوت دینا ہے۔“

حمید پاگل خانے میں

سر جٹ حمید نے جیتھرے لگا رکھے تھے۔ آنکھوں میں وحشت تھی اور شیو بڑھا ہوا تھا۔ بال بے ترتیب تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ان میں برسوں سے تیل نہ پڑا ہو۔ سر میں خس و خاشاک اور گرد و غبار کا عالم یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ سچ چاٹل ہو۔ چہرے پر متعدد چھوٹے چھوٹے زخم تھے جن پر کھرنڈ جننے لگی تھی۔ اس کے شناساؤں میں سے اگر کوئی اُسے اس حال میں دیکھ لیتا تو ہرگز نہ پہچان سکتا۔

وہ تین دن سے اس توقع پر شہر بھر میں مارا مارا پھر رہا تھا کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ اُسے پاگل خانے بھجوا دے۔ لیکن وہ ابھی تک تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس دوران میں اس نے متعدد شرارتیں کی تھیں مگر لوگوں نے اسے پاگل خانے بھجوا دینے کی بجائے اس کی حرکتوں میں خاصی دلچسپی لی۔ عموماً اس کے پیچھے ہر وقت چھوٹے چھوٹے بچوں کی خاصی بھیڑ ہوا کرتی تھی۔ اس نے فریدی سے کہا کہ اس درد سہی سے کیا فائدہ، براہ راست اسے پاگل خانے میں بھجوا دیا جائے۔ لیکن فریدی نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ فریدی کا کہنا تھا کہ مجرم بہت منظم معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا سی غلطی پوری اسکیم پر پانی پھیر سکتی ہے۔

جس دن سے ان دونوں پر حملہ ہوا تھا فریدی بہت زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ خود روپوشی اختیار کر کے اسی نے ڈی۔ آئی۔ جی سے استدعا کی تھی کہ وہ ڈاکٹر نارنگ سے مل کر حمید والے معاملے کی تحقیق کرے۔۔۔۔ اور یہ معاملہ تو اب کافی روشنی میں آچکا تھا کہ وہ لڑکی جو حمید کو اس عمارت میں پہلے نظر آئی تھی کرئل فرید کی روپوش بہن نادرہ ہی تھی۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے ڈاکٹر نارنگ کے منیجر سے جو پتہ حاصل کیا تھا وہ سرے ہی سے بیکار ثابت ہوا۔ اس عمارت میں ناگرم نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا تھا اور فلمی دنیا میں بھی کوئی اس نام سے واقف نہیں تھا۔ نہ کنول نامی کسی ایکٹریس ہی کا سراغ

مل۔ سکا اور اس خبر نے تو ڈی۔ آئی۔ جی کی رہی سہی امیدوں پر پانی ہی پھیر دیا کہ ڈاکٹر نارنگ نے اپنے منبر کو اسی دن برطرف کر دیا تھا۔ بہر حال اب راجن کی بھی تلاش جاری تھی۔

ان دو تین دنوں کے دوران میں حمید کو بعض اوقات ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے وہ سچ مچ پاگل ہو گیا ہو۔ وہ قریب قریب ہر وقت دعا مانگا کرتا تھا کہ اسے پاک پروردگار اپنی پہلی فرصت میں پاگل خانے بھجوا دے۔ ورنہ یہ پیچھے پیچھے تالیاں بجاتے ہوئے چلنے والے شیریںچے مجھے سچ مچ پاگل بنادیں گے۔ اپنی اسکیم کامیاب ہوتے نہ دیکھ کر اس نے کئی بار سوچا کہ اب عورتوں کو بھی چیئرنا شروع کر دے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ عورتوں کو چھیرنے والے کو کسی طرح معاف نہیں کیا جاتا خواہ پاگل آدمی ہو خواہ پاگل کتا۔ بعض اوقات تو لوگ ایسے پاگل کتے کو بھی مار مار کر آدمی بنالیتے ہیں۔

آج صبح ہی سے وہ ادھر ادھر اچھل کود مچاتا پھر رہا تھا۔ کسی کو مسکرا کر آنکھ مارتا، کسی کو منہ چڑھایا اور کسی کو چونچ دکھاتا۔ صبح ہی صبح اس نے سب سے پہلی شرارت یہ کی تھی کہ ایک چور اسے کے گول چبوترے پر جا پڑھا تھا۔ ٹریفک کا سپاہی موجود نہیں تھا۔ اس لئے اسے اس کے فرائض انجام دینے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ وہ ناچ ناچ کر گذرتی ہوئی کاروں کو گذرنے اور رکنے کے اشارے کرتا۔ ڈرائیور ہنس ہنس کر اسے گھونہ دکھاتے اور گذر جاتے۔

وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک یہی کرتا رہا۔ پھر ڈیوٹی والا ٹریفک کا نشیبل آگیا اور اس نے بدقت تمام اسے چبوترے سے ہٹایا لیکن وہ بھی اسے پاگل خانے بھجوا دینے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ حمید دل ہی دل میں اسے گالیاں دے کر وہاں سے ہٹ گیا۔

لیکن آج اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ پاگل خانے ضرور جائے گا۔ بڑے چوک میں پہنچ کر سچ مچ اسے اپنی قسمت جاگتی معلوم ہونے لگی۔ اس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو دیکھا جو اپنی کار سے اتر کر فٹ پاتھ پر چڑھ رہا تھا۔ حمید نے سوچا کہ یہ آخری موقعہ ہے۔ اگر یہ بھی ہاتھ سے نکل گیا تو پھر مرتے دم تک پاگل خانے کا دیدار نصیب نہیں ہوگا۔

”ہائے جانی سنو تو سہی۔“ حمید ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پیچھے لپکتا ہوا بولا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ چلتا رہا۔

”اونیلی ہیٹ..... پلٹ میری جان..... ہائے رو جانی..... نیلی ہیٹ..... نیلی ہیٹ۔“

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پلٹ پڑا۔

حمید نے سینے پر ہاتھ مارا اور اُسے آنکھ مار کر مسکرائے لگا۔

”مری جان.... اب تو رحم کرو، عاشق دلگیر پر۔“

پتہ نہیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دل پر کیا گزرا رہی تھی۔ البتہ اس کے ذرا نیور نے جھپٹ کر حمید کی گردن پکڑ لی اور حمید اس سے لپٹ پڑا۔

اس طرح اُسے پاگل خانے پہنچنے کا موقع نصیب ہو گیا۔

پاگل خانے کے پھانک کے قریب ہی اندر کی جانب ڈپنسری تھی جس کے آگے ٹین کا سائبان پڑا ہوا تھا۔ حمید نے بے شمار آدمی دیکھے جو انتہائی سنجیدگی سے کسی نہ کسی کام میں مشغول تھے۔ کوئی پھولوں کی کیاریوں میں پانی دے رہا تھا۔ کوئی مہندی کی بازھ کتر رہا تھا۔ کوئی رسی بٹ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ پاگل تو کسی طرح نہیں ہو سکتے۔

اُسے ڈپنسری والے سائبان کے نیچے ایک بیچ پر بٹھا دیا گیا۔ اچانک ایک صاحب جو کافی لمبے ترنگے تھے اُس کے سامنے آکر کھڑا ہو گئے۔ حمید کا دل دھڑکنے لگا لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ وہ خود بھی تو پاگل ہے۔ اگر کسی سے ہاتھ پائی کی نوبت آگئی تو اسے تکلیف نہ کرنا پڑے گی۔

وہ صاحب تھوڑی دیر تک حمید کو گھورتے رہے پھر انہوں نے کو لمبے بلانا شروع کر دیئے۔

”اے.... اے.... یہ کیا کر رہا ہے۔“ سائبان کے نیچے سے کسی نے لاکارا۔

”بھائی کے سامنے دم ہلا رہا ہوں۔“ اُن صاحب نے آنکھوں سے حمید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

وہ دوسرا آدمی بھی چوتھے پر چڑھ آیا۔ اس کے چہرے پر لمبی سی ڈاڑھی لہرا رہی تھی اور آنکھوں میں ہلا کی سنجیدگی تھی۔

”ڈم....!“ اُس نے اپنی ڈاڑھی پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح ہلائی جاتی ہے.... ابھی تک تمہارا دماغ صحیح نہیں ہوا۔“

پھر اُن میں سے ایک ڈاڑھی ہلاتا رہا اور دوسرا کو لمبے مڑکا تار ہا۔

حمید نے اٹھ کر ناچنا شروع کر دیا۔ عافیت اسی میں نظر آئی۔ آخر وہ بھی پاگل ہی تو تھا۔

جو لوگ ادھر ادھر کاموں میں مشغول تھے وہ بھی ایک ایک کر کے اکتھا ہونے لگے۔ بڑی

مشکل سے پاگل خانے کے منتظموں نے اس ہنگامے کو فرو کیا۔

تھوڑی دیر بعد حمید کا طبی معائنہ شروع ہوا جو اتنی جلدی اور لاپرواہی سے ختم کر دیا گیا کہ حمید کو حیرت ہونے لگی۔

بہر حال ڈاکٹر نے رپورٹ میں لکھا کہ وہ ایسا پاگل نہیں تھا جسے کہیں الگ باندھ کر رکھا جائے۔ حمید کے چیتھڑے اُتروا کر پاگل خانے کا لباس پہنایا گیا جو ایک جاگھیا ایک شلو کے اور ایک بد وضع سی ٹوپی پر مشتمل تھا۔

اُسے باغ میں نئی کھیا ریاں کھودنے اور کھاد ڈالنے پر لگادیا گیا۔

حمید کی نظریں اُسے ڈھونڈ رہی تھیں جس کے لئے وہ یہاں آیا تھا۔

اس کے ساتھ اور بھی کئی آدمی اُسی کام پر لگے ہوئے تھے۔ وہ انہیں بار بار گھورنے لگتا تھا کہ آخر انہیں پاگل کیسے سمجھ لیا جائے۔ وہ سب نہایت سنجیدگی اور خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

دفعۃً باغ کے باہر اس جگہ شور سنائی دیا جہاں کچھ پاگل رسیاں بٹ رہے تھے۔ حمید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ایک پاگل ایک درخت کے تنے سے چمٹا ہوا چیخ رہا تھا۔ ”مار ڈالوں گا.... سالے کو.... دھت تیری کی....!“

وہ اپنا سینہ تنے سے ٹکائے زور کر رہا تھا۔ پاگل خانے کے دو محافظ اُس کی طرف جھپٹے۔ پہلے تو انہوں نے اُسے ہٹانے کی کوشش کی لیکن جب کامیاب نہ ہوئے تو اس پر کوڑے برسانے شروع کر دیئے۔ مگر وہ درخت سے لپٹا ہی رہا اور پھر کچھ دیر بعد بیہوش ہو کر گر پڑا۔ ڈپنٹری سے اسٹریچر آیا اور اسے اس پر ڈال کر مریضوں کے وارڈ میں پہنچادیا گیا۔ حمید کے ساتھی خاموشی سے پھر اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک بولا۔

”اس کے لاشعور میں بچپن ہی سے ظالمانہ رجحانات پرورش پاتے رہے ہیں۔“

حمید بوکھلا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ پچاس بچپن سال کا ایک قوی الجشہ آدمی تھا۔ چہرے پر گھنی اور بڑی ڈاڑھی تھی۔ پیشانی کشادہ اور چمکدار تھی۔ آنکھیں غمناک اور دھندلی تھیں ناک کے جوڑ پر نظر آنے والا نشان ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اب سے پہلے کبھی چشمہ لگاتا رہا ہو گا۔

”لاشعور حیوانی جیتوں کا گہوارہ ہے۔“ اس نے ایک پاگل کو مخاطب کر کے کہا۔ ”سنسرت سمجھتے ہو۔“ پاگل نے نفی میں سر ہلا دیا اور پہلے پاگل نے کہا۔ ”ایک قسم کا منطقی شعور سمجھ لو۔ احتساب بھی کہہ سکتے ہو۔ منطقی شعور دراصل حیوانی جیتوں کے لئے ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ مگر تم اسے کیا سمجھو گے۔ خیر اسے یوں سمجھو میں اس وقت ناچنا چاہتا ہوں لیکن مجھے نہ ناچنا چاہئے۔ منطقی شعور کہتا ہے کہ تم یونیورسٹی کے پروفیسر ہو۔ تمہیں ہرگز نہ ناچنا چاہئے.... لیکن میں ناچنا شروع کر دیتا ہوں۔“

اس نے جھج جھج گاگا کر ناچنا شروع کر دیا۔

سیاں نے انگلی مروڑی رے.... رام کسم شرمائی میں۔

وہ ٹھک ٹھک کر اپنی انگلی مروڑتا اور شرماتا رہا اور ساتھ ہی گھنٹی ڈانڈھی میں فاحشہ عورتوں کی طرح مسکرانے کی کوشش بھی کرتا جا رہا تھا۔

”شراب۔“ ایک محافظ کا کوڑا اس کی پیٹھ پر پڑا اور وہ تمللا کر دوہرا ہو گیا۔ جب محافظ چلا گیا تو اس نے گھٹنوں میں منہ دیکر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

حمید سوچ رہا تھا کہ یہ پاگل بھی غیر شعوری طور پر جابر قوتوں سے خائف رہتے ہیں ورنہ یہ محافظ بس اس کے ایک ہی تپھیر کافی ہوتا۔ وہ حقیقتاً کوئی پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا کچھ تعجب نہیں کہ اس کا پروفیسر والا حوالہ درست ہی رہا ہو۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد مختلف حصوں سے شور اٹھتا پھر ”شراب شراب“ کی آوازیں آئیں اور سکوت طاری ہو جاتا۔

شام ہو گئی لیکن وہ نہ ملا جس کی حمید کو تلاش تھی۔ پانچ کے گھنٹے کے ساتھ ہی کام رکوا دیا گیا تھا۔ لیکن اب بھی بعض ایسے تھے جو کام ہی سے چپے رہنا چاہتے تھے اور انہیں کام سے الگ کرنے کے لئے بھی محافظ کو کوڑے پھینکانے پڑتے اور پھر جب وہ سب اپنی بارکوں کی طرف لوٹ رہے تھے تو ایک پاگل نے حمید کے قریب آکر آہستہ سے کہا۔

”کل تک میرا گھونسلہ مکمل ہو جائے گا اور پھر میں اڑ کر اس میں جا چھپوں گا.... انڈے دوں

گا۔ بچے نکالوں گا.... چوں.... چوں.... چر چر چر چر....!“

پھر وہ راستے بھر چوں چوں چر چر کرتا گیا۔

بارکوں کے قریب پہنچ کر حمید شش و پنج میں پڑ گیا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ کسی نے اسے رات کے قیام کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہاں مختلف قسم کی عمارتیں تھیں۔ بعض عمارتوں میں ایسی کوٹھریاں تھیں جن میں لوہے کی سلاخوں والے دروازے تھے۔ ان میں غالباً خطرناک قسم کے پاگل رکھے جاتے ہوں گے۔ ایک بہت بڑا مین کانشیڈ بھی تھا۔ جس کے نیچے بے شمار پانگ تھے جن پر نمبر پڑے ہوئے تھے۔

حمید سوچ رہا تھا کہ اسے بھی پاگل پن کی کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کرنی چاہئے لیکن پھر محافظوں کے کوڑے کا خیال کر کے اس کی روح لرز گئی۔

دفعۃً اسے قریب ہی کہیں بھیئیں کے ڈکرانے کی آواز سنائی دی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک پاگل نیم کے درخت سے پیٹھ رگڑ رگڑ کر بھیئیں کی سی آوازیں نکال رہا تھا۔ حمید چونک پڑا۔ حالانکہ اس کا چہرہ ڈاڑھی اور مونچھوں سے ڈھکا ہوا تھا لیکن خدو خال وہی تھے، وہی آنکھیں.... یہ ساجد ہی تھا۔ حمید نے فریدی کے فائل میں گھنٹوں اس کی تصویر دیکھ کر اس کے خدو خال کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی تھی۔

جیسے ہی حمید اس کے قریب پہنچا اس نے جھپٹ کر اس کے سینے میں سر اڑا دیا اور پیچھے کی طرف ریلنے لگا۔ حمید نے قدم ہٹا دیئے تھے۔ اس نے اس کا سر اپنے بازوؤں میں جکڑ کر آہستہ سے کہا۔ ”بیٹے.... بیٹے ساجد.... تم پاگل نہیں ہو۔“

ساجد تڑپ کر اس کے بازوؤں سے نکل گیا۔ وہ اسے حیرت اور خوف کے ملے جلے انداز سے گھور رہا تھا۔

کمرل کی اڑنے والی رائفل نے وزیر خزانہ کا خون کر دیا۔ حمید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نادرہ ابھی تک غائب ہے۔ اب تمہیں بولنا ہی پڑے گا اور اگر نہیں بولو گے تو بہت سخت طریقے اختیار کئے جائیں گے۔“

”تم کون ہو۔“ ساجد خوفزدہ آواز میں بولا۔

”میں کوئی بھی ہوں۔ لیکن تمہیں بولنا ہی پڑے گا۔“

”میں کچھ نہیں.... جج.... جانتا.... میں پگاگل....!“

”ہو نہہ پاگل!.... پاگل تو میں بھی ہوں۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ یہاں

میڈیکل سٹ قاعدے سے ہوتا ہی نہیں۔ محض پچھلی ہسٹری دیکھ کر پاگل پن کی قسم کا تعین کر کے نمبر لگادیے جاتے ہیں۔ چلو بیٹے اگلو جلدی اس قسم کی حرائوری ہر محکمے میں ہو رہی ہے۔“

”میرا.... شائد.... میرا وقت بھی قریب آگیا ہے۔“ ساجد آہستہ سے بڑبڑایا۔

”تو کیا تم نے ہی کر تل کو قتل کیا تھا۔“

”نہیں! ہرگز نہیں۔“

”پھر تمہاری موت کیوں قریب آگئی ہے۔“

”مار ڈالو.... مار ڈالو.... لیکن مار ڈالنے سے پہلے کسی بلی کی طرح مجھے چوہا سمجھ کر کھیلو

مت۔“ ساجد نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

”جب تم مجرم نہیں ہو تو تمہیں کس بات کا ڈر ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”بہلاؤ نہیں مجھے۔“ ساجد کا منہ ہوا بولا۔ ”مارنا ہے تو مار ہی ڈالو.... اب تو تمہیں یہ بھی

معلوم ہو گیا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔“

حمید اس کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہا تھا۔ اس طرح اچانک جھپٹ بیٹھنے کا اس پر جو رد عمل

ہوا تھا وہ بھی اس کے پیش نظر تھا۔

”تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو۔“ حمید اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا اور وہ چیخ کر پیچھے ہٹ گیا۔

”میرا تعلق محکمہ سراغ رسانی سے ہے۔“ حمید پھر بولا۔

ساجد کسی خوفزدہ شکاری کی طرح دبک رہا تھا۔

”اگر تم یہ چاہتے ہو کہ شہمیں یہاں سے نکال کر پولیس والوں کے سپرد کر دیا جائے تو مجھے

کوئی اعتراض نہیں۔“

”نہیں.... نہیں!“ ساجد مضطربانہ انداز میں بولا اور تھوڑی دیر تک اسے غور سے دیکھنے

کے بعد کہنے لگا۔

”تو تم مسٹر کیو کے آدمیوں میں سے نہیں ہو۔“

”مسٹر کیو؟“ حمید حیرت سے بولا۔ ”یہ کون بلا ہے۔“

”مجھے بچاؤ۔“ ساجد بچوں کی طرح سسکیاں لیتا ہوا بولا۔

”ڈرو نہیں!“ حمید نرم لہجے میں بولا۔ ”یہ مسٹر کیو کون ہے۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”تم نے پھر وہی ضد شروع کر دی۔“

”خدا کی قسم میں نہیں جانتا۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کسی کو اس کے متعلق کچھ معلوم ہو۔ بہر حال مجرموں کا ایک جم غفیر اس کا تابع فرمان ہے۔“

”اور تم بھی انہیں میں سے ایک ہو۔“

”مم... میں۔“ وہ ہٹلا کر رہ گیا۔

”گھبر او نہیں۔ تم سرکاری گواہ بنا کر چھوڑ دیئے جاؤ گے۔“

”میں یہیں بہتر ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”شاید مسٹر کیو مجھے بیچ عدالت میں بھی زندہ نہ

چھوڑے۔“

”اوہ....! تو کیا وہ ایسا ہی خطرناک آدمی ہے۔“

ساجد صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”وہ ہزاروں آدمیوں کا شہنشاہ ہے۔“ ساجد تھوڑی دیر بعد بولا ”لیکن ان میں سے شاید ہی

کسی کو معلوم ہو کہ ایک کا دوسرے سے کیا تعلق ہے۔“

”ہوں۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”میں سمجھ گیا! تم کس طرح اس کے چکر میں پھنسے تھے۔“

ساجد نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے سے ہچکچاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

”میں دراصل! مجھ سے ایک بار ایک جرم سرزد ہو گیا تھا جس کے متعلق میں یہ سمجھتا تھا کہ

اس پر ہمیشہ پردہ پڑا رہے گا۔“

”چلو میں تم سے اس کے متعلق کچھ نہیں پوچھوں گا۔“ حمید جلدی سے بولا۔

”لیکن....!“ ساجد بولتا رہا۔ ”مسٹر کیو کو اس کا علم تھا۔ اس نے مجھے بلیک میل کیا۔ مجھے اس

کی طرف سے ایک خط ملا جس میں اُس جرم کی تفصیل درج تھی اور مجھے دھمکی دی گئی تھی کہ اگر

میں نے مسٹر کیو کی ہر خواہش کے آگے سر نہ جھکا دیا تو اس کی اطلاع پولیس کو دے دی جائے گی۔“

”تو تم نے اسے کس طرح مطلع کیا تھا کہ تمہیں مسئلہ ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ٹیلی فون کے ذریعے اس نے نمبر لکھا دیا تھا.... کہ اگر مجھے منظور ہو تو اس نمبر پر فون

کر دوں۔“

”نمبر یاد ہے؟“ حمید نے کہا۔

”ہاں.... تھری زیرو۔“

”تھری زیرو!“ حمید حیرت سے بولا۔ ”یہ تو ٹیلی فون ایکسچینج کا نمبر ہے۔“

”میں جانتا ہوں.... لیکن نمبر یہی تھا۔“ ساجد بولا۔

”پھر....؟“

”پھر اس نے مجھے دوسرے خط کے ذریعہ کرئل فرید کے یہاں سیکریٹری کی جگہ حاصل کرنے کی کوشش کا حکم دیا۔“

”اسی رائفیل کے لئے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ہاں.... لیکن کرئل فرید بہت چالاک آدمی تھا۔ اس نے مجھے اس کی ہوا بھی نہ لگنے دی اور دوسری حیرت انگیز بات یہ کہ کرئل فرید بھی مسٹر کیو کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے قتل سے تین چار دن قبل مجھے اس کا علم ہوا تھا۔ اتفاق سے میرے ہاتھ دو تین ایسے خطوط لگ گئے جو مسٹر کیو نے اسے لکھے تھے۔ بہر حال مسٹر کیو کو بھی اس پر اعتماد نہیں تھا اس نے مجھے اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔ جس رات اس کا قتل ہونے والا تھا مجھے مسٹر کیو کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ میں رات کرئل فرید کے گھر پر نہ رہوں۔ مسٹر کیو کا وجود مجھے عرصہ سے الجھن میں ڈالے ہوئے تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں اس کا سراغ لگاؤں۔ چنانچہ میں نے اس کے حکم کی تعمیل نہ کی اور یہ دیکھنے کے لئے کہ اس نے یہ حکم کیوں دیا ہے میں کرئل کے مکان ہی میں چھپا رہا اور تقریباً بارہ بجے رات کو کسی نے پیچھے سے میرے سر پر کوئی دزنی چیز ماری اور میں بیہوش ہو گیا۔ دوسری صبح میں نے خود کو ایک کمرے میں مقفل پایا اور پولیس والوں کے بھاری بھر کم جو توں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ان میں سے کچھ قتل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں بُری طرح گھبرا گیا۔ پولیس والوں سے زیادہ مسٹر کیو کا خوف دامنگیر تھا۔ لہذا فوری طور پر اس کے علاوہ اور کچھ نہ سوچا کہ پاگل بن جاؤں۔“

ساجد خاموش ہو گیا۔ حمید بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

”آخر وہ لوگ اس کی بہن کو کیوں لے گئے۔“

”وہ اس رائفیل کے متعلق سب کچھ جانتی تھی۔ شاید استعمال کا طریقہ بھی اسے معلوم

تھا۔ ”ساجد نے کہا۔

”کیا وہ لڑکی بہت کم سخن تھی۔“

”بہت زیادہ۔“ ساجد نے کہا۔

”اس کی چال ایسی تھی؟“

”چال ہی تو سب کچھ تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی چال نہیں دیکھی ایسا معلوم ہوتا ہے

جیسے وہ زمین سے کچھ اوپر تیر رہی ہو۔“

”مسٹر کیو! اس کے ساتھیوں کے متعلق اور بھی پتہ جانتے ہو۔“

”کچھ بھی نہیں! بتایا نا کہ میں تقریباً تھپہ ماہ تک کرنل کے ساتھ رہا لیکن مجھے یہ نہ معلوم ہو۔“

کہ وہ بھی مسٹر کیو ہی کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ شاید اسے بھی میرے متعلق علم نہ رہا ہو۔“

”لیکن تمہیں اس کے یہاں ملازمت کس طرح مل گئی۔“

”مسٹر کیو کے خوف نے دلائی تھی وہ ملازمت۔ ظاہر ہے کہ اگر میں وہ ملازمت حاصل نہ

کر سکتا تو میرا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ جس کی دھمکی مسٹر کیو پہلے ہی دے چکا تھا۔ لہذا میں نے سر توڑ

کوشش کی اور کامیاب ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں مسٹر کیو ہی نے کوئی اور طریقہ اختیار کیا ہو۔“

”لیکن! تم کہہ چکے ہو کہ کرنل نے تم پر رائفل کا راز کبھی نہ ظاہر ہونے دیا۔ اس کا تو یہ

مطاب ہوا کہ وہ تمہاری حقیقت سے واقف تھا۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ قطعی واقف نہیں تھا۔“ ساجد بولا۔

”بہر حال اس رائفل نے ایک بہت بڑے آدمی کی جان لے لی۔ خیر اب تم کیا کہتے ہو۔“

”میں رہنا چاہتے ہو یا کوئی اور انتقام کیا جائے۔“

”نہیں میں یہیں بہتر ہوں۔“ اس نے کہا اور ایک طرف چلا گیا۔ حمید دیر تک کھڑا

اندھیرے میں گھورتا رہا۔

رنگ اور بھنگ

دوسری صبح نہ جٹ حمید بہت مشتعل تھا۔ پالگوں کے خوف سے اسے رات بھر ٹھیک سے

نہیں نہیں آئی تھی اور ویسے بھی سوتا ہی کہاں۔ اس کیلئے خاص طور پر کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ پورے پاگل خانے میں بد نظمی ہی بد نظمی نظر آتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہاں کے عملہ کے دماغوں میں بھی فتور ہے۔ اُسے رات بھر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا رہنا پڑا تھا۔

صبح ہوتے ہی وہ پاگل پھر بارکوں اور سانیٹوں سے جانوروں کی طرح ہانک دیئے گئے اور یہ انسانی مشینیں پھر چل پڑیں۔ ان کی آنکھیں ویران تھیں اور چہرے ہر قسم کے جذبات سے یکسر عاری۔ صرف ان کے جسم حرکت کر رہے تھے۔ جب کبھی اُن میں سے کسی نے ذہن کی رو بہکتی تو اس پر کوڑے برسے لگتے اور جب وہ درد سے بے تاب ہو کر چیختا تب بھی اس کے چہرے پر تکلیف کے احساس کے آثار نہ ہوتے۔ آنکھیں بدستور ویران اور کھوئی کھوئی ہوتیں۔ بس یہ معلوم ہوا جیسے یہ آواز کسی مشین ہی سے نکلی ہو۔

حمید پھر اپنے پچھلے ہی دن والے کام میں آگیا۔ بھوک کے مارے برا حال تھا۔ پچھلی رات بھی اُسے بھوکا ہی رہنا پڑا تھا۔ کیونکہ ابلی ہوئی پتلی اور بدبودار دال باجرے کی سخت روٹیوں کے ساتھ حلق سے نہ اتاری گئی تھی۔ بہر حال اب اُسے خوف تھا کہ کہیں اس بھوک کی حالت میں محافظوں کے کوڑے نہ کھانے پڑیں۔ آج اسے ان لوگوں میں ساجد بھی دکھائی دیا جو ایک نیم کے درخت کے نیچے چٹائی بن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر انہیں کے آثار تھے اور آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ وہ تقریباً دو گھنٹے سے سر جھکائے بیٹھا چٹائیاں بن رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی کسی خوفزدہ گیدڑ کی طرح سر اٹھا کر اپنی پشت کی طرف دیکھنے لگتا اس کے قریب ہی چھ اور بھی تھے۔ وہ بھی اس کی طرح خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف نظر آ رہے تھے۔

دفعۃً حمید نے ایک چیخ ماری اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ساجد اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک پاگل پر ٹوٹ پڑا۔ قبل اس کے کہ محافظ اس کی طرف دوڑتے اس کا سر کئی بار نیم کے تنے سے ٹکرا دیا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے کسی جڑے ہوئے کتے کی سی غراہٹ بھی نکل رہی تھی۔ دو محافظوں کو بھی بُری طرح بھنبھوڑا۔ کئی محافظ اور آگئے انہوں نے اسے رسیوں سے جکڑ کر ان بارکوں کی طرف روانہ کر دیا جہاں خطرناک قسم کے پاگل رکھے جاتے تھے۔

حمید سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اب سچ پاگل ہو گیا ہے۔ یا پھر یہ مسئلہ کیونکہ محفوظ رہنے کے لئے دوسری حکمت عملی تھی۔ ظاہر ہے کہ اب اسے ایک الگ کمرے میں بند کر دیا جائے گا اور اس

وقت تک باہر نہ نکالا جائے گا جب تک ڈاکٹروں کو یقین نہ ہو جائے کہ وہ اب کسی پر حملہ نہیں کرے گا۔

ہنگامہ فرو ہونے کے ایک گھنٹے بعد ایک محافظ حمید کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ نیچے جھک کر شلو کے کی پشت پر پڑے ہوئے نمبر دیکھے اور حمید سے اٹھنے کو کہا۔
 ”پپ.... پیافوں۔“ حمید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”چل بے۔“ اُس نے حمید کی گردن پکڑ کر دھکا دیا۔ حمید پپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ڈسپنری کے سانپان کے نیچے ایک آدمی کھڑا ڈاکٹر سے گفتگو کر رہا تھا۔ وہ حمید کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ حمید سمجھ گیا کہ وہ فریدی کے ملاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ سوچنے لگا کہ کمال کا بھیس بدلا ہے ظالم نے.... مسٹر کیو کیا مسٹر کیو کا باپ بھی اسے نہیں پہچان سکتا۔ فریدی نے اس سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اسے پاگل خانے سے نکالائے گا۔ حمید نے دل ہی دل میں توبہ لگا لیا اور سوچنے لگا۔ آج پھٹے ہو دو سو۔ مری جان۔ فریدی صاحب۔ اب کم از کم چار گھنٹے پریشان کئے بغیر نہ مانوں گا۔

”آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔“ وہ ڈاکٹر صاحب سے دردناک آواز میں کہہ رہا تھا۔
 ”یہ میرا گابھائی ہے اور میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ بڑی مشکل سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب اس پر راضی ہوئے ہیں۔“ پھر وہ حمید کی طرف مڑ کر بڑے پیار سے بولا۔
 ”جو میاں۔“

”بھائی جان۔“ جو میاں سلمہا بھچٹ کر اُس سے اپٹ گئے اور وہ گھبر آکر پیچھے ہٹ گیا۔
 حمید نے دل میں سوچا کہ غصب کا ایکٹر ہے۔ اس گھبراہٹ میں کتنا بے ساختہ پن تھا۔ یہ گھبراہٹ کتنی قدرتی تھی۔ اگر گابھائی بھی پاگل ہو جائے تو لوگ فیہ شعوری طور پر اس سے خائف ہی رہتے ہیں۔

”ماتا بوں استاد۔“ حمید نے دل میں کہا۔ ”مگر میں تمہیں تنگ نہ روڑوں گا۔“
 وہ اپنے ساتھ کپڑے بھی لایا تھا۔ سفید کرتا اور پاجامہ۔ پاگل خانے کے کپڑے اتروائے گئے۔ پاگل خانے کے باہر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ حمید اچھل کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کار چل پڑی۔ حمید اس کی بیٹھ پر ہاتھ پھیر پھیر کر اسے چکار رہا تھا۔ راستہ خاموشی سے طے ہوتا رہا۔ حمید

سوچ رہا تھا کہ شاید فریدی اس کی افتاد طبع کی بنا پر خاموش ہے۔ سوچتا ہوا کاکہ اکر میں نے بولنے میں پہل کی تو حمید نچائے بغیر نہ چھوڑے گا۔ خیر صاحب دلیلتا ہے کہ یہ خاموشی کتنی دیر قائم رہتی ہے۔ حمید سوچ رہا تھا کہ وہ ان تکالیف کا گن گن کر بدلہ لے گا جو اُسے پاگل خانے میں اٹھانی پڑیں تھیں وہ اولگھتا اور سوچتا رہا۔۔۔ ڈیڑھ دن کی تھکن اور پچھلی رات کی بیداری کے اثرات اس کے ذہن پر حاوی ہوئے گئے اور وہ سیٹ کی پشت سے لگ کر خراٹے لینے لگا۔

پھر اسی وقت اس کی آنکھ کھلی جب اسے پہچاننے پر رونا دکھایا گیا۔

کار ایک عالی شان عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ کار سے اتر کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر پتھہ بولنے لگی وانا! تمہارے اپنی شہرت والی اسٹیم کا خیال آگیا۔

”غررر.... غررر.... غررر....!“ اس نے حلق سے آواز نکالی اور اپنی دانست میں فریدی کے ساتھ گھسنے لگا جو اس کا ہاتھ تھامے اندر کھینچنے لگے جا رہا تھا۔

متعدد رابداری کے چکر کاٹنے کے بعد وہ ایک بڑے کمرے میں پہنچے اور پھر حمید کی روح بچ بچ فنا ہو گئی۔ کمرے کے وسط میں وہی حبشی طاوت کھڑا تھا۔ جسے اُس نے اپنی الف لیلیٰ والی رات کو ڈاکٹر نارنگ کے بنگلے میں دیکھا تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ لیکن وہ سوچ رہا تھا کتنی زبردست غلطی ہوئی اب اسے سچ سچ فریدی پر غصہ آنے لگا تھا۔ اگر اس نے یقینی طور پر کوئی ڈھنگ کی بات بتادی ہوتی تو وہ مجرموں کے ہاتھ میں کیوں پڑتا مگر خیر اس نے شروع ہی سے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس کی بناء پر اُسے پاگل نہ سمجھا جاتا۔ اس نے مذاق ہی مذاق میں اب تک اپنا پاگل پن برقرار رکھا تھا اور یہاں سے نکل بھاگنے کا بس ایک یہی حربہ رہ گیا تھا۔ حمید اپنے دل و دماغ کو متوقع اور غیر متوقع ہر قسم کے حادثات کا مقابلہ کرنے کے لئے قوت اراہی کے تحت منظم کرنے لگا۔ حمید کے ساتھی نے اسے طاوت کی طرف دھکیل دیا۔ طاوت اپنے لیے چوڑے بازو پھیلاتے آئے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ حمید نے اُس کے جسم سے ٹکرات ہی ٹکرات میں ہاتھ ڈال کر دو عدد دیوے اس کے رخساروں پر رسید کر دیئے۔

طاووت کی گرفت ذہیلی پڑ گئی اور وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ حمید چاروں خانے چپت زمین پر گر۔ طاووت حیرت سے آنکھیں پھاڑے حمید کو ٹھور رہا تھا۔ حمید پھر اٹھ کر اس کی طرف جھپٹا اور طاووت نے اپنے دونوں ہاتھ آگے طرف تان دیئے۔ حبشی بڑا قند آور تھا۔ حمید شاید اس کے

کندھوں سے بھی نیچا رہا ہو۔ طاوت اُسے بٹانے کی کوشش کر رہا تھا اور حمید اس لئے بار بار اچھل رہا تھا کہ شاید دو چار بو سے اور نصیب ہو جائیں۔ ویسے اسکے منہ کی بدبو سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ وہ شخص جو حمید کو اپنے ساتھ لایا تھا اب تحاشہ قہقہے اگا رہا تھا۔ پھر اچانک وہ سنجیدہ ہو کر انگریزی میں غرایا۔ ”یہ بنا ہوا پاگل ہے۔ تمہیں اسے راہ راست پر لانا ہے۔“

”نہیں..... نہیں.....“ حبشی غلط سلاط انگریزی میں چیخا۔ ”یہ سچا پاگل ہے۔“

”کو نہیں! اسے ٹھیک کرو۔“

”کیوں..... تم جھوٹے پاگل ہو۔“ حبشی نے کھسیانے انداز میں پوچھا۔

”جھوٹ..... جھوٹ۔“ حمید کتے کی طرح جھونکنے لگا۔ حبشی کا منہ چوم لینے کی کوشش ابھی تک جاری تھی۔

”کتیا کے بچے۔“ حبشی نے ہنس کر اس کی گردن دبوچی اور حمید پوٹ کھائے ہوئے کتے کی طرح ”چیاؤں چیاؤں“ کرنے لگا۔ طاوت پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ حمید کو چھوڑ چھڑا کر الگ ہٹ گیا۔ کبھی پیٹ دباتا اور کبھی منہ۔

”خاموش خاموش۔“ دوسرا آدمی حلق پھاڑ کر چیخا۔

طاوت کی ہنسی رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ حمید اب دوسرے آدمی کی طرف جھپٹا۔ پہلے تو اُس کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار نظر آئے۔ لیکن دوسرے لمحے میں سنبھل کر اس نے جو ایک ہاتھ جھارا ہے تو میاں حمید کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا لہذا توازن برقرار نہ رکھ سکے کی بناء پر ڈھیر ہو گیا۔ لیکن وہ بھی طے کر چکا تھا کہ چاہے جان چلی جائے شکست نہیں تسلیم کروں گا۔ وہ جھپٹ کر پھر اٹھا اور یہی حرکت دہرائی۔

حبشی پیٹ دبانے پورے کمرے میں ناچتا پھر رہا تھا۔ حمید کی اس حرکت نے قوا ت بے دم کر دیا۔

”کیا بلڑے۔“ دوسرے کمرے میں ایک تیز قسم کی نسوانی چیخ سنائی دی اور ایک لڑکی اندر کھس آئی۔ لیکن اب حمید اپنے چہرے پر تجرے کے آثار پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ حمید اسے نظر انداز کر کے طرح طرح کی حرکتیں کرتا ہوا حبشی ہی کے پیچھے دوڑتا رہا۔

”طاوت۔“ دوسرے آدمی نے اُسے پھر لاکارا؟ ”خاموش رہو! ورنہ گولی مار دوں گا۔“

اچانک وہ سہم کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ دراصل اب اس میں ہنسنے کی سکت ہی نہ رہ گئی تھی۔ حمید نے سوچا کہ اب تھوڑی سی خدمت اس لڑکی بھی کرنی چاہئے۔

اس نے ڈرامائی انداز میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور قدیم ہندوستانی رقص کا ایک پوز بناتا ہوا لڑکی کے سامنے جھک گیا۔ پھر اس کے بعد لٹھک کے بول بولتا ہوا جو ناچا ہے تو ایک ساتھ کتھا کلی، بھارتیہ نائٹیم اور منی پور کے وہ وہ بینترے دکھائے ہیں کہ حبشی پر تو گویا ملک الموت ہی سوار ہو گیا۔ لڑکی بھی ہنس رہی تھی اور وہ دوسرا آدمی کبھی ہنستا تھا اور کبھی جھنجھلا کر پیر پیٹنے لگتا۔

”یہ پاگل نہیں ہے.... ہرگز نہیں ہے۔“ وہ حلق کے بل چیخا اور حمید کا گریبان پکڑ لیا۔ ”تم پاگل نہیں ہو۔ میں تمہاری کھال اڑا دوں گا۔“

حمید نے دانت نکال کر قبہ لگایا جو اتنا ہڈیانی قسم کا تھا کہ لڑکی خوفزدہ آواز میں چیخ پڑی۔ دفعتاً قریب ہی کسی کمرے میں فائر کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی شیشوں کے ٹوٹ کر گرنے سے چھٹانے بھی پیدا ہوئے۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں حمید نے پھر قبہ لگایا۔ وہ سمجھا شاید پولیس آگئی۔

”اسے دیکھو۔“ دوسرے آدمی نے حبشی سے کہا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکل آیا۔ راہداری میں رک کر وہ دونوں شاید اندازہ لگانے لگے کہ آواز کس کمرے سے آئی تھی۔ پھر وہ ایک کمرے میں گھس گئے۔ سامنے والی کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر زمین پر بکھر گیا تھا اور کمرے میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مرد کی نظر سامنے والی میز پر پڑی جس پر ایک بوتل رکھی تھی وہ جھپٹ کر اس کے قریب آیا۔ بوتل کے نیچے ایک کانڈ کا ٹکڑا دبا ہوا تھا جس پر پلٹھ تحریر تھا وہ اسے اٹھ کر پڑھنے لگا۔

”کیا ہے؟“ لڑکی اس کے قریب پہنچ کر بولی۔

”مسٹر کیو۔“ اس نے سرگوشی کی۔ لڑکی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔ لیکن اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اس کی سزا موت ہے۔“ وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ ”مسٹر کیو کو دیکھنے کی خواہش ہی جرم ہے۔“

”ہوں! جیسے میں جانتی نہیں۔“ لڑکی بڑے ناز سے چپک کر بولی۔

”نہیں.... تم نہیں.... جان سکتیں۔“ وہ مضطربانہ انداز میں بولا۔

”تم مسٹر کیو ہو۔“ لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔

مرد نے ایک ڈراڈر اساقبہ لگایا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑے ہوئے پھر اسی کمرے میں آگیا جہاں حمید کو چھوڑ گیا تھا۔ بوتل جس میں کوئی سیال شے بھری ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ یہاں حمید اور حبشی دونوں ہی تھک کر بیٹھ گئے تھے۔

”اے مضبوطی سے پکڑو۔“ اس نے حبشی سے کہا۔ حمید اس کے ہاتھ میں بوتل دیکھ کر پہلے ہی ڈراتا تھا حبشی نے اسے اس طرح جکڑ لیا تھا کہ ہاتھ پیر بلانا بھی مشکل نظر آنے لگا۔

لڑکی کے ساتھی نے بوتل سے حرق نکال نکال کر اس کے منہ پر چھینٹے مارنے شروع کر دیئے۔ حمید محسوس کر رہا تھا کہ چہرے پر چپکے ہوئے پلاسٹک کے ٹکڑے اپنی جگہ چھوڑ رہے ہیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب جان بچنی محال ہے۔ بہر حال وہ تن بہ تقدیر ہو بیٹھا۔ ایک ایک کر کے پلاسٹک کے سارے ٹکڑے نکال لئے گئے اور دفعتاً وہ لڑکی چیخ اٹھی۔

”ارے.... یہ تم ہو! امرود بخت۔“

حبشی اسے چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ حمید تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”ہاں.... میں.... سر جنٹ حمید؟.... اور اب واپس جا رہا ہوں۔“

حمید دروازے کی طرف مڑا لیکن حبشی جھپٹ کر درمیان میں آگیا۔

”اس کا مطلب۔“ حمید لڑکی کے ساتھی کی طرف مڑ کر بولا۔

”انسپکٹر فریدی کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا لیکن تمہیں پچھتا نا پڑے گا۔“ حمید اپنا اوپری ہونٹ بھیجنے لگا۔

”پاگل خانے کیوں گئے تھے؟“ اس نے اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”تم ہو کون؟“ حمید بگڑ کر بولا۔

مرد نے پھر حبشی کی طرف دیکھا اور اس نے حمید کو پکڑ لیا۔ حمید نے تعرض نہیں کیا تھا۔ وہ

جانتا تھا کہ ہاتھ پیر مارنے کا وہی انجام ہوگا جو کسی دلدل میں پھنسے ہوئے آدمی کا ہوتا ہے۔ وہ

اجنبی طرح اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ حبشی کی قوت کا عشر عشر بھی نہیں رکھتا۔

”فریدی کہاں ہے۔“ مرد نے آگے بڑھ کر حمید کے منہ پر تھپڑ مارا۔

حمید حتی الامکان پر سکون رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم جانتے ہو کہ میں اتنی آسانی سے تمہارے ساتھ کیوں چلا آیا۔“ حمید نے اس سے پوچھا۔
وہ حیرت سے حمید کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے شاید یہ توقع نہیں تھی کہ حمید اتنا پرسکون نظر
آئے گا۔

”میں جانتا تھا کہ تم ڈاکٹر ناگہر ہو۔“

”پھر....؟“

”میں سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے اس طرح کنول سے ایک بار پھر ملاقات ہو جائے۔“ حمید
مسکرا کر بولا۔

کنول اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے خاموش کھڑی تھی۔ حمید کے اس جملے پر اس کے
چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

”سنو ناگہر! یا جو کچھ بھی تمہارا نام ہو۔ میں اس لڑکی کو تم سے یقین لے جاؤں گا۔“ حمید نے
پھر کہا۔

”فریدی کہاں ہے۔“ ناگہر کرج کر بولا۔

”کنول! میں وہ دلچسپ رات ابھی تک نہیں بھولا۔“ حمید نے ناگہر کی سنی ان سنی کمرے
بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

اسی بار پھر ناگہر نے ایک بھر پور باتھ حمید کے منہ پر مارا اور حمید تو حقیقتاً اس وقت کمال ہی
کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا اسے تو بین اور چوٹ کا کچھ احساس ہی نہ ہو۔

”میں پتھر ہوں میرے دوست....!“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہیں اس
باتھ کی ڈریسنگ نہ کرائی پڑے۔“

”میں تمہیں مار ڈالوں گا۔“ ناگہر حلق کے بل چیخا۔

”کوئی نئی بات نہیں۔ ہزاروں بار یہ جملہ سن چکا ہوں اور ہزاروں ہی ایشیم میں نے اپنے
قدموں میں دیکھی ہیں۔“

”نہیں ذرا واسے۔“ ناگہر نے حبشی کو مخاطب کیا اور حبشی کی گرفت تنگ ہو بنے لگی۔

حمید کو اپنی ہڈیاں کڑکڑاتی معلوم ہو رہی تھیں۔ لیکن وہ حتی الامکان کوشش کر رہا تھا کہ اس

کا جسم ڈھیلا نہ ہونے پائے۔ اپنے ذہن کو دررے احساس سے بچانے کے لئے اس نے بڑبڑانا

شروع کر دیا۔

”کنول! میں تمہیں اس جن کے قبضے سے نکال لے جاؤں گا۔۔۔۔۔ یہ کہنی کا ایجنٹ مل گیا ہے۔“

”سٹ اپ۔۔۔۔۔!“ کنول نے اسے ڈانٹا۔ پھر اپنے ساتھی سے کہنے لگی۔ ”اس سے کیا فائدہ۔ تم غصے میں حکم کی تعمیل نہیں کر رہے ہو۔ مار ڈالنے کا حکم تو نہیں۔“

دفعہ اتایا معلوم ہوا جیسے ناگربو ش میں آگیا ہو۔

”چھوڑ دو۔“ اس نے طاوت سے کہا۔

اور حمید ایک صوفے پر جم گیا۔

”ایک سگریٹ پلاؤ گے۔“ اس نے بڑی لاپرواہی سے ناگربو کو مخاطب کیا۔

”کیا یہ پاگل نہیں ہے۔“ لڑکی حیرت سے بولی۔

”نہیں۔“ ناگربو کے لمبے میں ختی تھی۔

حمید ہنسنے لگا۔ کنول اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”یہاں تمہیں معلوم نہیں کہ تم قتل بھی کئے جاسکتے ہو۔“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”تمہارے لئے میں دس بار قتل ہونا منظور کر لوں گا۔“ حمید نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

ناگربو کنول کی طرف پلٹا۔ ”اپنے کمرے میں جاؤ۔“ اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ کنول کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ حمید نے اس کی آنکھوں میں نفرت کی ہلکی سی جھلک دیکھی لیکن پھر وہ دوسرے ہی لمحے میں مسکرائے۔ اس نے ایک اچھتی سی نظر حمید پر ڈالی اور کمرے سے چلی گئی۔

”میں نے تم سے ایک سگریٹ مانگی تھی۔“ حمید نے ناگربو کو مخاطب کیا۔ ناگربو کے چہرے پر شدید قسم کی الجھن نے آثار تھے۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر حمید کے سامنے ڈال دیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس سے یہ حرکت بے خیالی میں ہوئی ہو۔

”مگر نہیں ایسی حالت میں سگریٹ پینے سے ممکن ہے مجھے غش ہی آجائے؟“ حمید نے بڑبڑا کر کہا۔

”کیوں؟“ ناگربو نے چونک کر پوچھا۔

”میں کل ات سے بھوکا ہوں۔“ حمید نے کہا۔ ”پاگل خانوں کی مذاہوش مندوں کے لئے

قطعی ناموزوں ہے اور پھر میں تو کھانے کی میز سے بعض اوقات محض اس لئے اٹھ جاتا ہوں کہ کسی طشتری سے کچے مسالے کی بونہ آتی ہو۔“

”تم پاگل خانے کیوں گئے تھے۔“ ناگر نے میسانتہ پوچھا۔

”ایک آدمی کی تلاش میں! جس کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ بنا ہوا پاگل ہے۔“ حمید نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ چھپانا بے کار ہے۔ مجرم ان کی اسکیم سے واقف ہو گئے ہیں ورنہ وہ اس وقت یہاں نہ ہوتا۔

”لیکن یہ اطاع غلط ثابت ہوئی۔“ حمید بولتا رہا۔ ”کیونکہ آج ہی اُس نے ایک دوسرے پاگل کو قریب قریب ختم ہی کر دیا ہے اور اب اُسے خطرناک پاگلوں کی کونٹھری میں بند کر دیا گیا ہے۔“

”تم اُس سے ملے تھے۔“

”نہیں.... اُسے تو میں نے اس وقت پہچانا جب محافظ اُسے زنجیروں میں جکڑے ہوئے کو ٹھڑی کی طرف لے جا رہے تھے۔“

”وہ کون ہے۔“ ناگر نے پوچھا۔

”تم آخر مجھے یہاں لائے کس لئے ہو۔“ حمید نے بات اڑادی۔ ”اس رات کو مجھے یہ قوف بنانے کا کیا مطلب تھا۔“

”دیکھو دوست....!“ ناگر نرم لہجے میں بولا۔ ”بہتر یہی ہے کہ تم فریدی کا پتہ بتا دو۔ ورنہ یہ بڑی خراب جگہ ہے۔“

”اس کا علم یہاں داخل ہوتے ہی ہو گیا تھا۔“ حمید نے کہا۔ ”میں پوچھتا ہوں۔ تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہیں۔“

”ہم لوگ بہت بُرے ہیں اور فریدی کا پتہ چاہتے ہیں۔“ ناگر مسکرا کر بولا۔

”اور یہ حقیقت ہے کہ مجھے نہیں معلوم، کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔“

”یہاں....!“ ناگر چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”ضد کا نتیجہ موت ہی ہوا کرتی ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ آج بھی مذاق ہی کر رہے ہو۔“ حمید نے ایسی سنجیدگی سے کہا جس میں لا پرواہی بھی شامل تھی۔

”اے....!“ ناگر حبشی کی طرف دیکھ کر چیخا۔ ”ترکیب نمبر تیرہ۔“

حمید کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ترکیب نمبر تیرہ کیا چیز تھی۔ حبشی اُسے گود میں اٹھا کر ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ پھر اسکے دونوں ہاتھ پشت پر جکڑ دینے گئے اور ناگرنے کوڑا سنبھالا۔

چھلانگ لگانے والا

حمید کی آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ پورے جسم میں کچھ اس قسم کی سوزش تھی جیسے اس کی کھال اتار کر کسی نے اُسے نمک کے ذہیر میں دبا دیا ہو۔

پچاس کوڑے تک تو اُس نے گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اچھا ہی ہوا کہ اُسے فریدی کے پروگرام کا علم نہیں تھا ورنہ ممکن تھا کہ وہ اس اذیت سے بچنے کے لئے سب کچھ بتا ہی دیتا اپنی زندگی میں شاید پہلی بار اس نے اتنی بے بسی محسوس کی تھی لیکن پھر بھی یہ یقین کر لینے کی کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آرہی تھی کہ فریدی اس کی طرف سے غافل ہو گا۔

اچانک ایک تیز قسم کی روشنی کا بڑا سادھبہ اس کی پشت کی طرف اندھیرے میں ریگ آیا۔ حمید چونک پڑا۔ لیکن وہ اتنی ہی تیزی سے مزنہ کا۔ کیونکہ جسم کو جنبش دینے کا خیال ہی اذیت ناک تھا۔

کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور سوچ آج کرنے کی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔

یہ کنول تھی۔ لیکن وہ پہلے کی طرح تروتازہ نظر نہیں آرہی تھی۔ حمید نے اسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں.... وہ تھوڑی دیر تک کھڑی اُسے دیکھتی رہی پھر اس کے قریب ہی زمین پر دو زانو بیٹھ گئی۔

حمید نے پھر آنکھیں کھولیں اور تکلیف کی شدت سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔

”تم بتا کیوں نہیں دیتے۔“ کنول نے سرگوشی کی۔

”میں نہیں جانتا۔“ حمید نے نحیف آواز میں کہا۔ ”اور اگر جانتا بھی ہوتا....“

”یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔“ کنول کی آواز دردناک تھی۔

”کون؟“

”میں تمہارے لئے کیا کروں۔“ کنول کی آواز میں بے چینی اور بے ہوشی تھی۔

حمید نے ہلکا سا قہقہہ اگایا اور کنول متحیرانہ انداز میں دیکھنے لگی۔

”تم کیا کرو گی۔“ حمید بولا۔ ”وہی کوڑا اٹھلاؤ۔۔۔۔ اور تم بھی شروع ہو جاؤ۔“

کنول نے اپنے دانت اتنی سختی سے بھیجنے لئے کہ جیڑوں کا گوشت ابھر آیا۔ شاید وہ آنسوؤں کے ایک میساختہ قسم کے اہال کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ البتہ اس کی غمگین آنکھیں حمید کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”تم کل رات سے بھوکے ہو۔“ اُس نے پھر سرگوشی کی۔

”ٹھیک یاد آیا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”کیا تم آج مجھے وہی خواب آور دوائیں دے سکتیں۔“

مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میرے جسم پر دھکتے انگاروں سے لکیریں کھینچی دی گئی ہوں۔“

وہ سچ مچ رو پڑی۔ لیکن اُس نے جلد ہی اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور خوفزدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

کبھی دور بھاری قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی جو رفتہ رفتہ نزدیک آتی گئی اور پھر حبشی اپنے ہاتھوں پر ایک بڑا سا پیالہ اٹھائے ہوئے نظر آیا اُسے دیکھتے ہی کنول حمید سے بلند آواز میں بولی۔

”میں کہتی ہوں تمہیں بتانا ہی پڑے گا ورنہ سکا سکا کر مار ڈالے جاؤ گے۔“

”میں نہیں جانتا۔“ حمید نحیف آواز میں بولا۔

حبشی نے پیالہ کنول کے قریب رکھ دیا۔ چند لمحے خونخوار آنکھوں سے حمید کی طرف دیکھتا رہا پھر چلا گیا۔

کنول نے پیچھے سے حمید کے منہ میں دودھ پکانا شروع کیا۔

”میں۔۔۔ تمہیں۔۔۔ اس جن۔۔۔ کے قبضے سے۔۔۔“ حمید رک رک کر بولتا رہا۔ ”ضرور۔۔۔۔۔“

”رہائی دلاؤں گا۔“

کنول کچھ نہ بولی۔

”مجھے یقین ہے۔“ حمید اسے ہاتھ کے اشارے سے روک کر بولا۔ ”اس میں بھی کوئی چال

ہو سکتی ہے۔“

”میں نہیں سمجھی۔“

”تم مجھ سے ہمدردی جتا کر مجھ سے کچھ معلوم کرنا چاہتی ہو۔“

کنول نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولی لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔۔۔ اور حمید کا دعویٰ تھا کہ مرتے دم تک عورتوں کی آنکھوں کی زبان سمجھتا رہے گا۔

”تم نے اس رات مجھے یہ قوف کیوں بنایا تھا۔“ حمید نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

”نہیں بتا سکتی۔۔۔ لیکن۔۔۔ تم کسی طرح یہاں سے نکل جاؤ تو اچھا تھا۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”یونہی۔“

”مسٹر کیو کا خوف۔“ حمید نے کہا اور کنول بے ساختہ اچھل پڑی اور اس کے بعد اس سے جو فعل سر زد ہوا وہ قطعی اضطراری تھا۔ وہ جھپٹ کر دروازے کی طرف لگی اور ادھر ادھر جھانک کر پھر واپس آگئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ تھوک نگل کر آہستہ سے بولی۔

”خاموش رہو۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔!“

”باہر کوئی ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور پھر بیٹھ کر اس کے حلق میں دودھ پکانے لگی۔

”خدا کے لئے۔“ وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔ ”یہاں کسی کے سامنے اس کا نام نہ لینا ورنہ اسی

وقت ختم کر دیئے جاؤ گے۔“

”تم نے اسے دیکھا ہے۔“

”کسی نے نہیں دیکھا۔“

”تم اس کے پچھلے میں کس طرح پھنسیں۔“

”یہ سب مت پوچھو۔“

”تاگر کون ہے!“

”یہاں سے نکلنے کے لئے کچھ سوچو۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”تمہارا نام کنول ہے یا کچھ اور۔“

”جی ہے! یہی ہے۔“ وہ بے چینی سے بولی۔ ”تم اتنے مطمئن کیوں ہو۔“

”میں ہر حال میں مطمئن رہتا ہوں۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔

”تب تم بھی جن ہی معلوم ہوتے ہو۔“ کنول نے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔

چوٹوں کی تکلیف معمولی نہیں تھی لیکن حمید کسی طرح بھی یہ نہیں ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ خوفزدہ ہے یا اس نے کوزوں کی اس بارش کو ذرہ برابر بھی اہمیت دی ہے۔

”تم بہت اچھی ہو۔“ حمید اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا ہوا پیار بھر سے لہجے میں بولا۔

”تم سچ امرود بخت ہی معلوم ہوتے ہو۔“ کنول مسکرا پڑی۔ ”کچا لو بن گیا ہے تمہارا اگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔“

”اگر اس وقت منہ میں دودھ نہ ہوتا تو کچا لو کے نام پر پانی بھر آیا ہوتا۔“

کنول صرف مسکرا کر رہ گئی۔ حمید سوچ رہا تھا کہ ساجد کی بات ٹھیک ہی نکلی کسی ”مسٹر کیو“ کا وجود ضرور ہے اور یہ لوگ بھی اس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا دل چاہا کہ کمرل کی بہن نادرہ کے متعلق بھی پوچھے لیکن فوراً خیال آگیا کہ وہ اپنی پاگل خانے والی ناکامی کی داستان ناگہر کو سنا چکا ہے۔

اس کا ذہن پھر بو جھل ہوتا جا رہا تھا۔ پیالے کا دودھ ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر کنول کو روک دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک میٹھی اس کو دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔ حمید نے نیند کے دباؤ سے جھٹکتی ہوئی پلکوں کو زبردستی اٹھا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”شکریہ! میرے لئے یہی بہتر ہے۔ آج کی خواب آور دوا زیادہ فائدہ مند ثابت ہوگی۔“

اور پھر وہ سو گیا۔ کنول تھوڑی دیر میٹھی اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی اور پھر اٹھ کر باہر چلی گئی۔ وہ راہداری کے موڑ پر پہنچی تھی کہ کسی ہت ٹکرا گئی۔ پیالہ ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ یہ ناگہر تھا اور بری طرح بدحواس نظر آ رہا تھا۔

”پولیس....!“ وہ بانپتا ہوا بولا۔ ”طاوت کہاں ہے۔“

”باورچی خانے میں۔“

”چلو....!“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوڑتا ہوا بولا۔ ”پولیس نے کھیر اڑال دیا ہے۔“

باورچی خانے سے انہوں نے طاوت کو لیا اور ایک تاریک راہداری میں گھستے چلے گئے۔ تھوڑی سی دیر میں پوری عمارت پولیس والوں کے بھاری قدموں کی آوازوں سے گونجنے

گئی۔ گوشہ گوشہ چھان لیا گیا لیکن حمید کے علاوہ اور کوئی نہ ملا۔ حمید گہری نیند سو رہا تھا۔ پولیس والوں نے اسے اس کی کوٹھڑی سے نکال کر ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر ڈال دیا۔ پھر وہ عمارت کی تلاشی لینے میں مشغول ہو گئے اور انہیں اس کا بھی دھیان نہ رہا کہ وہ حمید کو تنہا چھوڑ آئے ہیں۔ کو تو اسی انچارج انسپکٹر جلدیش کے ساتھ دو سب انسپکٹ تھے اور وہ قیوں اس کامیابی کے خیال میں مگن تھے کہ ہر قسم کے خدشات سے گویا محفوظ ہی ہو گئے تھے۔

جب وہ تلاشی لے کر پلٹے تو ان کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ ڈرائنگ روم خالی اور حمید غائب تھا۔ وہ پھر دیوانوں کی طرح پوری عمارت میں پھیل گئے۔ لیکن الا حاصل حمید کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

حمید کو یقین تھا کہ اس کی نیند خود بخود نہیں ٹوٹی کیونکہ آنکھیں کھلتے ہی اسے اپنے منہ میں کسی کڑوی یا کیلی چیز کا مزہ محسوس ہوا اور ایک خاص قسم کی بو بھی اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔ وہ کراہ کر اٹھ بیٹھا۔ بستر بہت ہی نرم اور پر تکلف تھا اور ملائم تکیوں سے ویسی ہی خوشبو آرہی تھی جیسے وہ اپنے تکیوں کے لئے استعمال کرتا تھا۔ کمرہ بھی وہ نہیں تھا جس کے فرش پر چت لیٹے لیٹے اس نے کنول کے ہاتھ سے دودھ پیا تھا۔ اس کی نظریں کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر رنگ گئیں۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔۔۔ لیکن یہ کیا؟ چاندنی کی کمر میں زمین پر چلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ ایسی تعجب خیز بات تھی کہ وہ اپنی تکالیف کا احساس کئے بغیر اچھل کر کھڑا ہو گیا اور جھپٹ کر کھڑکی کے قریب پہنچا لیکن دوسرے ہی لمحے میں دل چاہا کہ اپنے منہ پر تھپڑ مارے۔ چاند کی کمر میں زمین پر نہیں بلکہ دریا کی لہروں پر چل رہی تھیں۔ کھڑکی سے تقریباً دس بارہ فٹ نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ داہنی طرف اسے پل نظر آیا اور پھر وہ کشم ہاؤس کی عمارت کو بھی پہچان گیا شاید وہ اسی عمارت کے کسی کوارٹر میں تھا۔ دفعتاً اسے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی اور وہ چونک کر مڑا۔ دروازے میں ایک آدمی نظر آیا جس کی شکل حمید کے لئے نئی تھی۔

”ڈرو نہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا اور حمید اس کی آواز پہچان کر اچھل پڑا۔

”یہ فریدی تھا۔“

وہ چند لمحے اُسے گھورتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

”آپ کے پاس ریو اور ہوگا؟“

”ہاں! کیوں؟“ فریدی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”تھوڑی دیر کے لئے ادھر اُدھر دے دیجئے۔“

”کیوں؟“

”میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو گولی مار دوں۔“ حمید حلق پہاڑ کر چیخا۔

فریدی اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور اس کا شانہ تھپکتا ہوا ہوا۔

”اگر تم اس وقت مجھے توپ سے بھی اڑا دو تو بُرا نہ مانو! گا! میرے اچھے بیٹے۔“

”دُرا پیٹھ دیکھئے میری۔“

”میں دیکھ چکا ہوں.... اور اس کے لئے ان کا جسم کا ایک ایک ریشہ ادھڑاؤں گا۔“

فریدی نے اُسے پلنگ پر لٹا دیا۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر حمید اپنی

داستان بیان کر چلا۔ حالانکہ اس نے سب سے پہلے اسی کے متعلق معلوم کرنا چاہا تھا کہ وہ یہاں

تک کیسے پہنچا۔ لیکن فریدی نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ خود اپنی روداد پہلے سنانے۔ جیسے ہی حمید نے

مسٹر کیو کا نام لیا فریدی تقریباً تھپل پڑا۔ وہ تحیر خیز نظروں سے حمید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”کچھ نہیں.... کہتے چلو.... پھر بتاؤں گا۔“

حمید نے بیان جاری رکھا اور جب وہ خاموش ہوا تو فریدی نے پوچھا۔

”وہ لڑکی.... یعنی نادہ بھی کہیں نظر آئی تھی۔“

”نہیں.... لیکن مسٹر کیو کے نام پر چونکے کیوں تھے۔ کیا آپ پہلے سے اس کی شخصیت سے

واقف ہیں۔“

”ہاں.... لیکن اس کی اس حیثیت کے متعلق شاید خواب میں بھی نہ سوچ سکتا۔“ فریدی پر

خیال انداز میں ہوا۔

”یعنی....!“ حمید کے لہجے میں حیرت تھی۔

”اس نام کا تعلق سیکرٹ سروس والوں سے ہے۔“

”آپ انہیں جانتے ہیں۔“

”میں صرف ان کی تعداد جانتا ہوں۔ وہ پانچ ہیں اور یہی نام استعمال کرتے ہیں کہاں ہیں؟

اور کون ہیں؟ اس کا پتہ نہیں۔ میں نے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ ان کا پتہ لگاؤں۔ وہ بھی بہر حال سرکاری ہی آدمی ہیں۔“

”اور ان کا ٹیلی فون نمبر بھی تھری زیرو ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ہاں....!“

”اور یہی ٹیلی فون نمبر ایکسچینج کا بھی ہے۔“

”ہاں؟ اور شاید یہی چیز تمہیں الجھن میں ڈالے ہوئے ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”قطعاً....!“

”مسٹر کیو کے لئے ٹیلی فون ایکسچینج میں خاص طور سے انتظام کیا گیا ہے۔ مسٹر کیو کے لئے کوئی کال آتے ہی ٹیلی فون آپریٹر اس کا سلسلہ ایک ٹرانسمیٹر سے ملا دیتا ہے۔ اس طرح ایکسچینج سے مسٹر کیو کے لئے ٹیلی فونک ٹرانسمیشن ہو جاتا ہے اور آپریٹر تک کو اس بات کا پتہ نہیں چلنے پاتا کہ یہ کال کہاں کے لئے آئی تھی۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ سیکرٹ سروس والے ہی....!“

”نہیں حمید صاحب۔“ فریدی مضطربانہ انداز میں بولا۔ ”اتنی جلدی کوئی فیصلہ صادر کر دینا ٹھیک نہیں ہے۔ بہت دنوں بعد ایسا کیس ملا ہے جس میں ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کی ورزشیں کرنا پڑیں گی۔“

وہ خاموش ہو کر سگار ساگنے لگا اور حمید بولا۔

”حمید صاحب! اگر اپنی کھال میں صحیح سلامت رہے تو؟“

”یار مجھے حقیقتاً ساری زندگی اس کا افسوس رہے گا کہ تم اس حال کو پہنچ گئے۔“ فریدی نے کہا۔

”خیر آپ کا یہ افسوس میری بیٹھ کی سوزش نہیں کم کر سکتا۔“

”مگر یہ تو سوچو کہ کنول نے تمہیں دودھ پلایا ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”بھینس کا دودھ پلایا تھا۔“ حمید جلدی سے بولا اور فریدی ہنسنے لگا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ.... راجن.... ڈاکٹر نارنگ کی دیہی جائیداد کا فیجر کہاں غائب

ہو گیا؟“ اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”اوہ....!“ حمید متاسفانہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے اس کے متعلق کنول سے پوچھنا چاہئے تھا....“

خیر.... اب آپ بتائیے کہ یہ کم بخت شہزادہ امرود بخت.... کیا وہ خصال بن کر یہاں تک کیسے پہنچا۔“
 ”حقیقتاً اس حادثے کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ہی ہے۔“ فریدی نے کہا اور پھر اپنے جوتے اتار کر اطمینان سے بیٹھتا ہوا بولا۔ ”میں نے تمہارے پاگل خانے بچنے والے واقعے کو شہرت دی تھی۔“
 ”شہرت دی تھی۔“ حمید حیرت اور غصے میں بولا۔

”جس لئے شہرت دی تھی اس میں کامیابی بھی ہوئی لیکن ایک جگہ دھوکا کھا گیا.... خیر.... بہر حال میں نے اس لئے اس معاملے کو شہرت دی تھی کہ مجرموں پر اس کا رد عمل دیکھ سکوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ تم پر قابو پانے کی کوشش ضرور کریں گے۔ چنانچہ ایک آدمی نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا جعلی اجازت نامہ بنایا اور اسے لے کر پاگل خانے پہنچ گیا۔ تم نے پاگل خانے کے تھوڑے فاصلے پر ایک دوسری کار بھی دیکھی ہوگی جس کے پیچھے گرانپ وائر کا اشتہار لگا ہوا تھا وہ میں نے اس کمپنی سے اس مقصد کے لئے حاصل کی تھی.... بہر حال میں نے اس پر تم دونوں کا تعاقب کیا۔“

فریدی رک کر۔ گار ساگنے لگا۔

”اور اس کے باوجود آپ اتنی دیر میں پہنچے۔“ حمید بھنا کر بولا۔

”سنئے تو جاؤ! اس عمارت کے سامنے پہنچ کر میں الجھن میں پڑ گیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس میں مغربی جرمنی کا سفیر رہتا ہے اور وہیں اس کا دفتر بھی ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ ایسے موقع پر جس قسم کی کاروائیاں ہوتی ہیں۔ میں نے نگرانی کیلئے ریمش اور وحید کو وہاں کر دیا اور خود ڈی۔ آئی۔ جی کے پاس پہنچا۔ بہر حال وہاں کی تلاشی کا اجازت نامہ حاصل کرنے میں دیر ہو گئی اور پھر جب وہاں گھیراؤ لے کر انتظام کیا جا رہا تھا تو اچانک یہ اطلاع ملی کہ عمارت دراصل خالی ہے۔ سفیر کا دفتر کئی دن ہوئے کسی دوسری عمارت میں منتقل ہو گیا ہے۔ دھوکا دراصل اس لئے کھا گیا کہ وہاں سے سفارت خانے کا بورڈ نہیں بنایا گیا تھا یا ممکن ہے کہ خود مجرموں ہی نے دوسرا لگا دیا ہو۔ بہر حال باہر تو بورڈ لگا ہوا تھا اور اندر ایک جگہ ایک تختی پر لکھا ہوا ملا۔ ”کرائے کے لئے خالی ہے“ خیر.... بے چارے جگدیش وغیرہ تو بھی سمجھ رہے ہوں گے کہ تم پھر مجرموں کے ہاتھ میں پڑ گئے۔“
 تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر حمید بولا۔

”تو وہ لوگ گر فٹار ہو گئے۔“

”کہاں.... کوئی ان کی گرد کو بھی نہ پا۔ کا۔ البتہ ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ پولیس نے دو گھنٹے تک جھک مارنے کے بعد ایک چور دروازے کا پتہ لگا لیا ہے جو ایک پتلی سی گلی میں کھلتا ہے اور جدھر کسی نے دھیان تک نہیں دیا تھا۔ یعنی ادھر پولیس نہیں تھی۔“

انور بھی کام کر رہا ہے یا نہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”میں نے ابھی تک تو اسے بلایا نہیں۔“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔ ”سب کو ایک ساتھ بھڑا دینا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ کیس بڑا پیچیدہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ تازہ دم لوگ بھی موجود رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حالات کوئی دوسرا رخ اختیار کر لیں۔ فی الحال.... میں نے یہ انتظام کیا ہے کہ ملک بھر میں اس وقت تک مائیکروفون استعمال نہ کیا جائے جب تک ایکسپرٹ یہ اطمینان نہ کر لیں کہ اس میں کوئی دوسرا سسٹم بھی تو نہیں پایا جاتا۔“

”ملک بھر میں....؟“ حمید حیرت سے بولا۔

”جناب.... یہ کوئی ملک گیر تنظیم معلوم ہوتی ہے۔“

کچھ دیر خاموشی رہی پھر فریدی بولا۔

”میرا خیال ہے کہ دانتوں پسینہ آجائے گا۔ کیونکہ اس مسٹر کیونے بڑا عجیب طریقہ اختیار کیا ہے۔“

”لیکن آپ تو سیکرٹ ہر وس....!“

”ٹھیک ہے۔“ فریدی حمید کی بات کاٹ کر بولا۔ ”یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ سیکرٹ سروس والے اس قسم کی کوئی حرکت کریں گے۔ اس کیس میں یہی تو ایک اہم نکتہ ہے میرا خیال ہے کہ وہ پانچوں سیکرٹ سروس والے دوسری دنیا میں پہنچ چکے ہیں۔“

”کیوں؟“

”ظاہر ہے کہ ان کی زندگی میں تو یہ ناممکن ہے کہ کوئی ان کا نام استعمال کر سکے۔“

وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ فریدی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اور حمید کا ذہن نیند کے تانے بانے میں الجھتا جا رہا تھا۔ دفعتاً وہ فریدی کی آواز سن کر چونک پڑا اور ساتھ ہی ایسا معلوم ہوا جیسے نیچے دریا میں کوئی وزنی چیز کافی اونچائی سے گری ہو۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ سمجھتا فریدی کھڑکی میں چڑھ کر دریا میں چھلانگ لگا چکا تھا۔ حمید پہلے تو اچھل کر کھڑکی کے قریب گیا پھر دروازے کی طرف بھاگا۔ آگے ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ حمید دروازہ کھول کر مکان کے باہر آگیا۔ باہر سناٹا تھا۔

غالباً رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ گھاٹ بھی بالکل سنان تھا اور پل پر آمد و رفت بھی ختم ہو چکی تھی۔ حمید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

وہ شاید ایک منٹ تک بے حس و حرکت کھڑا دریا کی سطح پر نظریں جمائے رہا۔ کچھ دور پر بڑی بڑی لہریں گرداب کی شکل میں اٹھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی سیاہ سی چیز سطح پر ابھرتی اور پھر ڈوب جاتی۔

حمید کا جسم اور دماغ دونوں ہی تقریباً بیکار تھے۔ یہاں تک وہ محض اضطراری فعل کے تحت پہنچا تھا اور اب اسے ایک منٹ کھڑا ہونا بھی دو بھر معلوم ہو رہا تھا۔ صرف ایک سوال اس کے ذہن میں تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ فریدی نے دریا میں پتلا لٹ کیوں لگائی تھی۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ کوئی تیرتا ہوا اسی طرف آ رہا ہے۔ فریدی نے کنارے پہنچ کر کسی دوسرے آدمی کو پانی سے کھینچ کر باہر نکالا۔

خونفک آنکھیں

فریدی اُسے کاندھے پر اٹھائے ہوئے گھر کے اندر چلا گیا۔ حمید اس کے پیچھے تھا۔ روشنی میں پہنچتے ہی حمید کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ فریدی نے اسے فرش پر ڈال کر اُس کے پیٹ سے پانی نکالنے کی تدبیریں شروع کر دی تھیں۔

”ہیلو....!“ دفعتاً وہ رک کر بولا۔ پھر مڑ کر حمید کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا یہ وہی نہیں ہے جو تمہیں پاگل خانے سے لے گیا تھا۔“

”ناگہ....!“ حمید آہستہ سے بولا۔

فریدی بدستور مشغول رہا۔ اُس نے اس کے گیلے کیڑے اتار کر اُسے ایک چادر میں لپیٹ دیا۔

حمید کھڑکی کے قریب کھڑا باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ بھی کوئی چال تو نہیں۔ پھر وہ صحن کی طرف جھپٹا اور باہر کے دروازے میں کنڈی لگا کر واپس آ گیا۔ فریدی کرسی پر بیٹھا بے ہوش آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا دواؤں کا بکس فرش پر کھلا رکھا تھا اور اُس نے اپنے ہاتھ میں انجکشن والی سرنگ سنبھال رکھی تھی۔

”تم کھڑے کیوں ہو؟“

”ہمیں غافل نہ رہنا چاہئے۔“ حمید جلدی سے بولا۔ ”کہیں یہ کوئی چال نہ ہو۔“

”جو کچھ بھی ہے ابھی ظاہر ہو جائے گا۔“ فریدی پر سکون لہجے میں بولا۔ ”تم اس آرام کرسی پر لیٹ جاؤ۔۔۔ مگر نہیں تمہاری پیٹھ اس قابل نہیں۔ بہتر تو یہی ہے کہ۔۔۔ اچھا ذرا ادھر آؤ۔“

پھر وہ اُسے برآمدے میں لا کر بولا۔ ”اسے شاید دو تین منٹ بعد ہوش آجائے۔ جب تک میں نہ کہوں تم اس کے سامنے مت آنا۔ یہاں اس پلنگ پر لیٹ جاؤ۔ بلکہ سو جاؤ تو بہتر ہے۔“

”کیا آپ نے اسے کو دتے دیکھ لیا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”اس نے پل پر سے چھلانگ لگائی تھی۔“ فریدی بولا۔

”پتہ نہیں کیا بات ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ یہ مسٹر کیو ہی کا کسی قسم کا عتاب ہو۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔۔۔ اس نے برآمدے میں پڑے ہوئے پلنگ کی طرف اشارہ کیا اور کمرے میں چلا گیا۔

ناگر کو ہوش آگیا تھا۔ وہ پلنگ پر چت پڑا متحیرانہ انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ فریدی پر نظر پڑتے ہی اچھل کر بیٹھ گیا۔ چند لمبے خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس طرح اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے جیسے دفعتاً اس کی بینائی ہی رخصت ہو گئی ہو۔ وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ ”مجھے جہنم میں جھونک دو! میں خود ہی کو دجاؤں گا۔۔۔ مگر میرا قصور۔۔۔ مجھے میرا قصور بھی تو بتاؤ۔۔۔ یا پھر مجھے مری جانے دو۔۔۔ اس طرح ادھیڑ موت۔۔۔ ایک چوہے کی طرح بے بس نہ کرو۔“

وہ خاموش ہو گیا پھر دفعتاً حلق پھاڑ کر چیخا۔ ”سنا تم نے۔“

”سن لیا۔۔۔!“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”میں ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔“ ناگر نے اپنی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹاتے

ہوئے کہا۔

لیکن وہ اب بھی فریدی کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

”اگر تم وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی اقدام خود کشی نہ کرو گے تو میں تمہیں پولیس کے حوالے نہ

کروں۔“ فریدی نے کہا۔

ناگر نے ایک لٹلے کے لئے فریدی کی طرف دیکھا اور پھر نظریں ہٹالیں۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے خود کشی کی کوشش کیوں کی تھی۔“ فریدی پھر بولا۔
 ”میں کچھ نہیں جانتا۔“ ناگر نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

”یعنی تم ارادہ نہ نہیں کرے تھے۔“ فریدی اسے پر خیال انداز میں دیکھ رہا تھا۔
 ”مجھے جانے دو۔“ ناگر اٹھتا ہوا بولا۔

”جاؤ....!“ فریدی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دکھائی دی۔ وہ اسے شرارت آمیز
 نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا لیکن شاید اس بار کسی ریوالور کی گولی کو تمہارے پیچھے کاراستہ تلاش
 کرنا پڑے۔

ناگر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحوں میں وہ پھر پلنگ پر گر کر اپنا برہنہ جسم چادر
 سے چھپانے لگا۔

”ذرو نہیں!“ فریدی نرم لہجے میں بولا۔ ”تم اب قطعی محفوظ ہو۔ یہاں میری موجودگی میرا
 کوئی تم پر ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتا۔ ویسے میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ تم دریا میں خود کو دے تھے یا
 کسی نے تمہیں پھینکا تھا۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”پھر وہی ضد....!“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے ذہن میں صرف یہی ایک خیال تھا کہ کوہ جاؤں بس کو د گیا۔“
 ”اور وہ تمہارا اپنا خیال نہیں تھا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”کیا....؟“ ناگر پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”یہی کہ تم خود سے نہیں کو دے تھے۔“

”تم کون ہو؟“ ناگر خوفزدہ آواز میں بولا۔

”ذرو نہیں! میں ان میں سے نہیں جنہوں نے تمہیں پتھرائنگ اگانے پر مجبور کیا تھا۔“
 ”پھر آخر کون ہو۔“

”بتاتا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور میز پر رکھے ہوئے کپڑے اٹھا کر اسے دیتا ہوا بولا۔ ”انہیں
 پہن لو۔“

ناگر نے قمیض اور پتلون پہنی لیکن اس کی تحیر آمیز نظریں بار بار فریدی کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ فریدی نے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

جیسے ہی ناگر کی نظر حمید پر پڑی وہ لڑکھڑا گیا۔ اگر فریدی سہارے کے لئے اپنا بازو آگے نہ کر دیتا تو اس کا سر دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔

حمید بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اب بتاؤ بیٹے ناگر صاحب۔“ وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

ناگر نے آنکھیں بند کر لیں۔

”غالبا... اب تم یہ سمجھ گئے ہو گے کہ میں کون ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

”پولیس....!“ ناگر کانپتا ہوا بولا۔

”میں یہ بھی جانتا ہوں۔“ فریدی نے حمید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”کہ تم پر یہ ساری مصیبتیں اس کی وجہ سے نازل ہوئیں تھیں۔“

”کیا....؟ مم.... میں نہیں سمجھا۔“ ناگر ہکا بکا۔

”تم نے اسے پولیس والوں کیلئے چھوڑ دیا تھا اور خود فرار ہو گئے تھے۔ لہذا تمہارے مسٹر کیو....!“

ناگر کی ایک بے ساختہ قسم کی چیخ نے فریدی کا جملہ نہ پورا ہونے دیا۔

”تم جھوٹے ہو۔“ ناگر نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا اور کمرے میں بھاگ گیا۔

پھر فریدی اور حمید نے بدحواسی کے عالم میں اسے پلنگ کے نیچے گھستے دیکھا۔

”بس....!“ حمید نے قہقہہ اگایا۔ ”چلو خیر! میں تمہیں سول پولیس کے رٹم و کرم پر چھوڑتا ہوں۔“ فریدی نے اسے بدقت تمام پلنگ کے نیچے سے نکالا۔

”تم.... تم.... مسٹر کیو کے آدمی ہو۔“ ناگر ہڈیانی انداز میں بک رہا تھا۔ ”میں کہیں نہیں بچ سکتا۔ کسی طرح نہیں بچ سکتا۔“

”تو تمہیں اسی طرح یقین دلایا جاسکتا ہے کہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔“ فریدی نے کہا۔

”جھوٹ.... بلف.... دھوکا.... مسٹر کیو کا نام اسکے آدمیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔“

”لیکن اس کا نام مسٹر کیو تو نہیں ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس نام سے بھی کوئی واقف نہیں ہے۔“

”ایسا تو نہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اس کے ساتھیوں کے علاوہ دو اور آدمی بھی ہیں جو اس نام سے واقف ہیں۔“

”کون؟“

”انسپکٹر فریدی اور سر جنٹ حمید۔“

”تبت..... تو..... آپ..... مسٹر فریدی..... ہیں۔“ ناگڑ کے لہجے میں حیرت تھی۔

فریدی مسکراتا رہا۔ ناگڑ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد پھر بولا۔

”تو پھر..... خدا کے لئے..... مجھے کسی بند گاڑی میں جیل خانے بھجوا دیجئے..... ورنہ وہ مجھے

زندہ نہیں چھوڑے گا..... اور میں نے ابھی تک کوئی ایسا جرم نہیں کیا جس کی سزا موت ہو۔“

”تم یہاں ہر طرح محفوظ رہو گے۔“ فریدی نے کہا۔ ”بشرطیکہ جو کچھ پوچھوں اس کا سچ مچ

جواب دو۔“

”میں سب کچھ کروں گا۔ مجھے بچائیے۔“

”تم جانتے ہو کہ مسٹر کیو حقیقتاً کون ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔“

”اسے کبھی دیکھا ہے۔“

”نہیں۔“

”اس رات جب تم نے سر جنٹ حمید کو ڈاکٹر نارنگ کے یہاں بے وقوف بنایا تھا تمہارے

ساتھ کتنی لڑکیاں تھیں۔“

”دو.....!“

”جو حمید سے پہلے ملی تھی کون تھی؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔ مسٹر کیو کے حکم سے میں اسے وہاں لے گیا تھا۔“

”تمہارے پاس وہ کب سے تھی۔“

”اسی دن آئی تھی۔ جس دن میں وہاں گیا تھا۔“

”کہاں سے آئی تھی۔“

”میں یہ بھی نہیں جانتا۔ مسٹر کیو کے حکم کے مطابق میں سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک

بند گاڑی میں بیٹھ گیا تھا..... وہ لڑکی..... حبشی..... اور کنول..... تینوں مجھے اس میں ملے تھے۔“
 ”کنول کون ہے۔“

”اس نے مجھ سے آج تک نہیں بتایا۔“

”ڈاکٹر نارنگ کے منیجر راجن سے تمہاری جان پہچان کس طرح ہوئی تھی۔“

”مسٹر کیو کے حکم کے مطابق میں نے اُس سے دوستی پیدا کی تھی۔“

”کیا راجن بھی اُسی کے آدمیوں میں سے تھا۔“

”کہہ نہیں سکتا..... ہو سکتا ہے کہ رہا ہو۔ مسٹر کیو کے گروہ کے لوگ ایک دوسرے کو اس

وقت تک نہیں جانتے جب تک کہ مسٹر کیو خود نہ چاہے۔“

”راجن تمہیں اس کے بعد ملا تھا۔“

”رر..... راجن.....!“ ناگر ہکا کر رہ گیا۔

”جھوٹ نہیں سنوں گا۔“ فریدی اُسے تیز نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

”اُسے مسٹر کیو نے ختم کر دیا۔“

”کیسے؟“

”مجھے مسٹر کیو کی طرف سے حکم ملا کہ میں راجن کو دلاور نگر والی سڑک سے لے کر جھریالی

کے جنگل میں مار ڈالوں۔ مدد کے لئے ایک آدمی بھی دیا گیا تھا۔ حکم تھا کہ لاش کو پیٹرول چھڑک

کر جلا دیا جائے۔“

”تو تم دونوں نے اُسے مار ڈالا۔“

”نہیں.....!“ ناگر گھبرا کر بولا۔

”پھر.....؟“

”جب وہ ہم سے چھٹ کر بھاگ رہا تھا تو کسی نے سرکنڈوں کی جھانپوں سے اُس پر فائر

کر دیا۔ لیکن لاش ہمیں ہی جلائی پڑی تھی۔“

”دوسرا آدمی کون تھا۔“

”پتہ نہیں..... اس دن کے بعد سے اب تک نہیں دکھائی دیا۔“

”خیر اب یہ بتاؤ کہ تم اس کے چکر میں کس طرح پڑے تھے۔“

ناگرتھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”اس نے مجھے بلیک میل کیا تھا۔“

پھر اس نے اسی قسم کی ایک داستان دہرا دی جیسی حمید کو پاگل خانے میں ساجد نے سنائی تھی۔ ناگرتھوڑی اصل منشیات کی ناجائز تجارت کرتا تھا۔ مسٹر کیو نے اسے ایک خط کے ذریعہ دھمکی دی تھی کہ اگر اُس نے اس کے احکامات کے آگے سر نہ جھکا دیا تو وہ اس کا راز فاش کر دے گا۔ اُسے بھی یہی ہدایت ملی تھی کہ وہ اپنے فیصلے سے فون کے ذریعے آگاہ کرے۔ نمبر وہی ”تھری زیرو“ تھا۔

”ٹیلی فون کرنے کے متعلق کوئی اور بھی ہدایت ملتی تھی۔“ فریدی نے پوچھا۔
 ”ہاں.... کہ گفتگو شخصی ٹیلی فون کی بجائے کسی پبلک ٹیلی فون بوتھ سے کی جائے۔“
 ”اس کے بعد کسی قسم کی گفتگو یا مشورے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”مسٹر کیو کے خطوط یا تو بذریعہ ڈاک آتے ہیں یا کسی دوسرے پراسرار طریقے سے مجھ تک پہنچتے ہیں۔“

”پراسرار طریقے سے۔“ فریدی نے کہا۔

”جی ہاں.... آج ہی! جب میں آپ کے ساتھی کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا مسٹر کیو نے مکان کے ایک حصے میں فائر کر کے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ جب ہم کمرے میں گئے تو ہمیں اُس کا خط ملا اور ساتھ ہی ایک بوتل بھی جس میں غالباً سیال ایندھن تھا۔ خط میں ہدایت تھی کہ میک اپ بگاڑنے کے لئے بوتل کا عرق استعمال کیا جائے۔“

”اوہ....!“ فریدی نے ہونٹ سکڑ کر کہا تھوڑی دیر کے لئے پھر خاموشی چھا گئی۔

”وہ لڑکی کہاں ہے.... کنول....!“ حمید نے پوچھا۔

فریدی اسے گھورنے لگا اور حمید نے مسکرا کر منہ پھیر لیا۔

”کنول.... میں نہیں جانتا کہ وہ اب کہاں ہے۔“ ناگرتھوڑی نے کہا۔

”لیکن تم تینوں ساتھ ہی تو بھاگے ہو گے۔“ فریدی بولا۔

”ہم وہاں ساتھ ہی پہنچے تھے جہاں ہمیں خطرات کے وقت پناہ لینے کا حکم ملا تھا۔ اس کے بعد

میں یہاں چلا آیا۔“

”کہاں گئے تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔ لیکن ناگر نے فوراً ہی جواب نہ دیا۔

”کیا.... میں یقین کر لوں کہ آپ میری حفاظت کریں گے۔“ ناگر نے پوچھا۔

”حتی الامکان....!“ فریدی کا مختصر سا جواب تھا۔

”ہم لوگ! بلی روڈ کی کوٹھی نہر سترہ میں گئے تھے۔“

”کس کی کوٹھی ہے۔“

”اس کا علم مجھے نہیں۔ پہلی ہی بار وہاں گیا تھا۔“

”پھر....!“

ناگر خاموش ہو گیا۔ اس پر پھر رشتہ طاری ہو گیا تھا۔

”اس کی یاد بھی میرے لئے پریشان کن ہے۔“ وہ کانپتا ہوا بولا۔

”سنو دوست!“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”ایک بات اور بھی واضح کرتا چلوں وہ یہ کہ مجھے

ایکنگ اور حقیقت میں فرق کرنے کا کافی سلیقہ ہے۔“

”میں جو کچھ بھی کہنے جا رہا ہوں اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ نہیں۔“ ناگر بولا۔

”خیر.... چلو....!“ فریدی۔ گار ساگاتا ہوا بولا۔

”وہاں اس عمارت کے ایک کمرے میں مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا

ایک دروازے کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے دو خوفناک آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ سرخ سرخ

خونی آنکھیں۔ میری ہمت نہیں تھکی کہ میں کسی طرح نظریں چرا سکتا۔ میں ان کی طرف دیکھتا رہا

اور مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے میرے جسم کی ساری طاقت ان خوفناک آنکھوں میں کھینچی

جاری ہو۔ پھر مجھے ایک تیز قسم کی سرگوشی سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ آواز ان آنکھوں سے

نکل رہی ہو۔ مجھ سے کہا جا رہا تھا کہ میں ایک بند گاڑی میں پل تک جاؤں اور وہاں سے دریا میں

چھلانگ لگا دوں۔ میں خاموشی سے مڑا اور باہر نکل آیا۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک ہی

خیال تھا کہ مجھے دریا میں چھلانگ لگانی ہے.... اچھی طرح یاد نہیں کہ میں پیدل پل تک آیا یا میں

نے حقیقتاً کسی بند گاڑی میں یہاں تک کا سفر کیا۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر فریدی تیز نظروں سے اس کے چہرے کو ٹٹولتا ہوا

بولا۔ ”اس آسانی رائفل کے بارے میں کیا جانتے ہو۔“

”آسمانی رانفل.... میں اسکے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“ ناگرنے کہا۔ ”کیا وہ بھی مسٹر کیو....!“
 ”غالباً....!“ فریدی اٹھ کر ٹہلتا ہوا ہوا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر فریدی اس کی طرف مڑ کر ہوا۔

”میں نے تمہیں اس سے محفوظ رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن اگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو شاید میں تمہارے مسٹر کیو سے بھی زیادہ خوفناک ثابت ہوں۔“

”میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں.... میں....!“

ناگرنے کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ فریدی چونک کر پلٹا۔ دروازے میں تین آدمی کھڑے تھے۔
 تینوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے اور ان کے چہرے سیاہ نقابوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔

ہموں کی بارش

فریدی کے سکون میں کسی قسم کا فرق نہ آیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ پھیل رہی تھی اور آنکھوں سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی ڈرامے کا ہیرو سل دیکھ رہا ہو۔
 ”مکان چھوٹا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اور مہمانوں کا تانتا بندھ گیا ہے۔“

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ آنے والوں میں سے ایک نے سرگوشی کی حمید اور ناگرنے اپنے ہاتھ اٹھادیے۔ لیکن فریدی بدستور کھڑا مسکراتا رہا۔ ناگرنے بڑی طرح کانپ رہا تھا۔

”مارنا مت۔“ دفعتاً فریدی چیخا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے ان تینوں آدمیوں کے پیچھے کھڑے ہوئے کسی آدمی کو مخاطب کیا ہو۔ تینوں چونک کر مڑے لیکن دوسرے ہی لمحے میں تینوں کے ریوالور زمین پر تھے اور فریدی ان پر پل پڑا تھا۔ وہ تینوں ایک ساتھ پیچھے کی طرف الٹ گئے۔
 حمید نے بے تحاشہ چھلانگ لگائی اور زمین پر پڑے ہوئے ریوالوروں پر قبضہ کر لیا۔

”ابے او گیدڑ کے بچے۔“ حمید نے ناگرنے کو لاکارا۔ لیکن اس نے سر اٹھانے کی بھی ہمت نہ کی۔
 وہ اسے اسی حال میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ فریدی ان تینوں سے گتھا ہوا تھا۔

”ہیڈ زاپ۔“ حمید آہستہ سے بولا اور فریدی انہیں چھوڑ کر الگ ہٹ گیا اور ان تینوں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے۔

تھوڑی دیر بعد حمید اور ناگرا انہیں رسیوں سے جکڑ رہے تھے اور فریدی ریو اور لئے کھڑا تھا۔
 ”اب یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔ ”تم دونوں یہیں ٹھہرو میں ابھی آیا۔“
 وہ باہر چلا گیا اور حمید قیدیوں کے چہروں سے نقاب نوچنے لگا۔
 ”ان میں سے کسی کو پہچانتے ہو۔“ حمید نے ناگرا سے پوچھا۔
 ناگرا نے نفی میں سر ہلادیا۔

وہ تینوں سر جھکائے زمین پر بیٹھے رہے۔
 ”تمہیں کس نے بھیجا تھا۔“ حمید نے انہیں مخاطب کیا۔
 لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ان میں سے دو تو خائف نظر آتے تھے۔ لیکن ایک کے
 چہرے پر اب بھی خوفناک عزائم کی جھلک تھی وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فریدی اندر داخل ہوا۔
 تینوں کو اٹھایا گیا۔ ان کے ہاتھ ان کی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔
 باہر کھڑی ہوئی کار میں انہیں دھکیل دیا گیا۔ اگلی نشست پر فریدی اور ناگرا بیٹھے پچھلی پر حمید
 تھا۔ مجرموں میں سے دو نیچے تھے اور تیسرا سیٹ پر۔

”تعاقب کا خیال رکھنا۔“ فریدی نے حمید سے کہا اور کار اشارت کر دی۔
 حمید پچھلے شیشے سے سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔۔۔ پھر ان کی کار جنگل کی طرف مڑ گئی۔
 ہل کے قریب والے کوارٹر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے جاتے وقت اسے بند کرنے
 کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ ان کے جانے کے تقریباً آدھ گھنٹے بعد ایک دوسری کار آکر
 وہاں رکی اور اس پر سے ایک آدمی نیچے اتر۔ اس کے علاوہ اس کار میں اور کوئی نہیں تھا۔
 اُس نے بھی اپنا چہرہ سیاہ نقاب سے چھپا رکھا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر
 آہستہ آہستہ چلتا ہوا کوارٹر کے دروازے کے قریب آکر رک گیا۔ شاید وہ آہٹ لے رہا تھا۔ اُس
 نے جھانک کر اندر دیکھا۔ پھر ایک کنکری اٹھا کر کوارٹر کے اندرونی سائبان پر پھینکی۔ ٹین کا سائبان
 چیخ اٹھا لیکن اس کے علاوہ اور کوئی آواز نہ سنائی دی۔

دوسرے لمحے میں وہ کوارٹر کے اندر تھا۔ صحن میں ایک کرسی الٹی ہوئی ملی جس کا ایک پایہ
 ٹوٹا ہوا تھا۔ تینوں قیدیوں کے نقاب فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں اٹھا کر دیکھا اور ایک
 عجیب طرح کی آواز اس کے منہ سے نکلی جو کسی بھیڑیے کی غراہٹ سے بہت کچھ مشابہ تھی۔

پھر وہ برآمدے میں آیا چند لمحے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ کمرے کا بلب روشن تھا۔

کمرے میں اُسے ناگہ کے بھیکے ہوئے کپڑے ملے جنہیں اس نے بہت احتیاط سے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر کمرے کی مختلف چیزیں اٹھنے پلٹنے کے بعد وہ کمرے سے نکل آیا۔ ناگہ کے کپڑے کار میں ڈال دیئے۔ اگلی سیٹ سے ایک چھوٹا سا صندوق اٹھایا جس سے ایک بڑا سا تار لٹک رہا تھا۔ زمین پر جھک کر اُس نے فریدی کی کار کے نشانات دیکھے اور وہ صندوق ایک پینے کے نشان پر رکھ دیا۔ تار کا سلسلہ موٹر کی بیٹری سے ملتا ہے صندوق کی سطح روشن ہو گئی۔ صندوق کا اوپری حصہ دراصل شیشے کا تھا۔ اس کے نیچے ایک بڑی سی سوئی تھی جو آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی۔ سوئی کے گرد و پیش بے شمار چھوٹی چھوٹی آڑی، ترچھی، اور سیدھی لکیریں تھیں۔ کہیں کہیں قوسیں، دائرے اور زاویے بھی نظر آ رہے تھے۔ سوئی اپنا چکر پورا کرنے سے قبل ہی ایک جگہ رک گئی۔ اُس نے جھک کر دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی کار بھی ادھر ہی جا رہی تھی جدھر فریدی کی گئی تھی۔ رات ڈھل رہی تھی اور چاند افق کی طرف جھک رہا تھا۔ سنانے کی چادر کائنات پر محیط تھی۔ چھبوں کے جنگلوں میں گھستے ہی فریدی کو کار کی رفتار کم کر دینی پڑی تھی راستہ ناہموار تھا اور بار بار حمید سوچنے لگتا تھا کہ کہیں کار الٹ ہی نہ جائے۔ چاند کے غروب ہوتے ہی اندھیرا پھیل گیا۔ دفعتاً حمید کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔

”کیا بات ہے۔“ فریدی نے چونک کر پوچھا۔

”تعاقب....!“

”کیا....؟“

”جی ہاں.... جہاز یوں میں.... ابھی دور ہیڈ انٹینس چمکیں تھیں.... غالباً کوئی کار ہی ہے۔“

”کک.... کون؟“ ناگہ بھلا کر رہ گیا۔

تینوں قیدیوں نے اچھلنا شروع کر دیا تھا۔

”ذرا ان کی کینٹی - ہلاؤ۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔

حمید کے تین ہی گھونسوں نے انہیں خاموش کر دیا۔ گھونسے کینٹیوں پر مارے گئے تھے۔

”ان میں سے کوئی بوش میں تو نہیں۔“ فریدی نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

حمید انہیں اچھی طرح بلا کر دیکھنے کے بعد بولا۔ ”سب ٹھیک ہے۔ اوہ وہ روشنی پھر.... قریب ہی معلوم ہوتی ہے۔“

فریدی نے کار روک دی لیکن انجن بند نہیں کیا۔ پھر وہ ٹائر کو بازو سے پکڑ کر اتر گیا۔ حمید اس کے پیچھے تھا۔

وہ تینوں قریب کی جھازیوں میں چھپ گئے۔

تھوڑی دیر بعد انہیں سچ مچ ایک کار دکھائی دی جو ان کی کار سے تھوڑے فاصلے پر رک گئی تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی ان کی کار کے پچھلے حصے پر پڑ رہی تھی۔ حمید نے ریو اور نکال لیا۔ ایک آدمی کار سے اتر کر نیچے کھڑا ہو گیا۔

”شش....!“ فریدی حمید کا بازو پکڑ کر آہستہ سے بولا۔ ”اسے کار کے قریب آنے دو۔“

اس آدمی کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ فریدی کی کار کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر رہا ہو۔ وہ چند لمبے اسی طرح کھڑا رہا.... پھر اپنی کار میں بیٹھ کر اسے پیچھے کی طرف لے جانے لگا۔

”چلو بڑھو....!“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”کوئی خطرناک ارادہ۔ اس کے قریب ہی رہو۔“

وہ تینوں اُس کی کار کے ساتھ ہی ساتھ پیچھے کی طرف چلتے رہے۔ کار کافی پرانے ماڈل کی اور گھنٹیا تھی۔ اس لئے اس کا انجن خاصا شور مچا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فریدی نے جھازیوں کی کھڑکھڑاہٹ کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ انجن کے شور میں جھازیوں کی آوازیں دب جائیں گی۔ تقریباً ایک فرائٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار رک گئی اور انجن بند ہو گیا۔ تاریکی اور سناٹے کا وہی عالم تھا۔

”آخر یہ کیا کرنے جا رہا ہے۔“ حمید نے سرگوشی کی۔

”دیکھتے جاؤ۔“ فریدی بولا۔

ٹائر کانپ رہا تھا۔

”اماں تم آدمی ہو یا بید مینوں۔“ فریدی نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ریو اور کی

نالی سامنے ہی رکھنا، ورنہ کہیں اپنے ہی گولی نہ مار لو۔“

پھر وہ حمید کی طرف مڑ کر بولا۔ ”ضرورت کے وقت فائر کرنے کی اجازت ہے۔“

وہ تینوں سینے کے بل ریختے ہوئے جھازیوں سے نکلے.... لیکن کار بالکل خالی تھی۔

”وہیں مار لیتے تو بہتر تھا۔“ حمید بڑبڑایا۔

فریدی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ پھر دوسرا اور ایسا معلوم ہوا جیسے پورے جنگل میں آگ لگ گئی ہو۔

”بھاگو...!“ فریدی حمید کا ہاتھ کھینچتا ہوا بولا۔

وہ تینوں تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑ رہے تھے۔

”آخر... باب... بات کیا ہے۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا... ایک دھماکا اور ہوا۔

”شاید اس نے کار پر بم مارا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور اب ادھر ادھر پھینک رہا ہے۔“

”مم... مسٹر کیو...!“ ناگر نے رونی آواز میں پوچھا۔

پھر دھماکہ ہوا۔ کار کے انجن کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

”جھاڑیوں میں... گھسیں؟“ حمید نے پوچھا۔

”بس بھاگتے رہو... ایسی حماقت نہ کرنا۔ یہ بم غالباً ادھر ادھر کی جھاڑیوں ہی میں پھینکے

جار ہے ہیں۔“

”تب تو مارے ہی گئے۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔

”بیٹے! حمید خاں! اس وقت اس سے الجھنا ٹھیک نہیں۔ معلوم نہیں اسکے پاس کتنے اور بم ہوں۔“

کار کی میڈلائٹس کا سلسلے سانسے کی جھاڑیوں کے اوپری حصے پر پڑ رہا تھا۔ کار شاید کسی پچھلے

نشیب میں تھی۔ ایک دھماکہ کہیں قریب ہی ہوا اور تیز قسم کی روشنی کے ساتھ ہی انہوں نے

آنچ بھی محسوس کی۔ دوسرے ہی لمحے میں کار سر پر تھی۔ تینوں نے دائیں طرف کی جھاڑیوں میں

چھلانگ لگادی۔ فریدی نے پلٹ کر کار پر فار کیا۔ دو ریوالور اور چلے۔ لیکن کار تیزی سے گزر گئی۔

وہ ابھی تک فار کئے جا رہے تھے۔

”چلو بس بھی کرو۔“ فریدی جھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

کار کے انجن کی آواز کہیں دور سنائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ بھی سنائے میں گھل مل گئی۔

”بڑی چوٹ ہوئی۔“ حمید بولا۔

”اس کے علاوہ نہیں کہ اب پیدل چلتے چلتے کچھ مر نکل جائے گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”شاید

ہموں کا اسٹاک ختم ہو گیا تھا۔“

”چلنے کار کی خبر لیں۔“ ناگر بولا۔

”کار.... شاید کار کے ٹکڑے بھی نہ ملیں۔ کیا تم روشنی نہیں دیکھ رہے ہو۔ آگ چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ بس اب یہاں سے نکل چلو۔“

”مجھ میں اب چلنے کی بھی تاب نہیں۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔

”چلو تو آؤ میری پیٹھ پر۔“ فریدی نے کہا۔

فریدی نے اُسے پیٹھ پر ادا لیا۔ آگ پھیلتی جا رہی تھی.... ناگر کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ فریدی اب بھی اتنی ہی آسانی سے دوڑ رہا تھا جتنی آسانی سے اب تک دوڑتا آیا تھا۔ ناگر کی سانس بڑی طرح پھول رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کاش سانس ہی درست کرنے کا موقع مل جاتا۔

سڑک پر پہنچ کر فریدی نے حمید کو اتار دیا۔ ناگر کر کر زمین پر ہانپنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ مسٹر کیو کے گروہ میں تم سب سے کچے تھے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”اگر.... میں.... میں.... آپ کے ساتھ.... نہ ہوتا.... تو.... میرا ہارٹ فیل ہو جاتا۔“

”وہ کار کس کی تھی۔“ حمید نے پوچھا۔

”سرکاری۔“ فریدی بولا۔ ”بھئی جلدی کرو! کم از کم دس میل پیدل چلنا پڑے گا۔“

”کیا بے بسی ہے۔“ حمید مضطرب سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”ہے تو۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن اگر ایسے میں تمہیں کوئی لڑکی مل جائے تو۔“

”جنہم میں گئی لڑکی۔“ حمید غرا کر بولا۔

”کیوں بھئی ناگر۔“

”جی.... مجھے تو آپ مسٹر کیو سے بھی زیادہ شبیب معلوم ہوتے ہیں۔“

”وہ تینوں مفت میں مارے گئے۔“ حمید نے کہا۔

”بھئی چلتے رہو۔“ فریدی۔ گار ساگاتا ہوا بولا۔

”مجھے تو اب بھی یقین نہیں کہ میں زندہ ہوں۔“ ناگر خوف زدہ آواز میں بولا۔

”کیوں....؟“

”مسٹر کیو! ایسے آدمیوں کو زندہ نہیں چھوڑتا جنہیں سمجھتا ہے کہ وہ پولیس کے ہاتھ لگ

جائیں گے۔“

”مگر! تم کہتے ہو کہ کسی نے اُسے آج تک دیکھا ہی نہیں ہے۔“

”جی ہاں!“

”پھر اسے کس بات کا خوف ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کے ساتھیوں کو پولیس پکڑ بھی لے تو

خود اس پر ہاتھ پڑنا محال ہے۔“

وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ کسی کو اس کا نام ہی معلوم ہو سکے۔

”اوہ....!“ فریدی نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔ ”ٹھیک ہی تو ہے۔ اگر پولیس کو یہ معلوم ہو گیا

کہ کوئی مجرم سیکرٹ سروس والوں کی ٹیلی فونک ٹرانسمیشن سروس استعمال کر رہا ہے تو اسے بند

کر دے گی اور مسٹر کیو ایک بہت بڑی آسانی سے محروم ہو جائے گا۔“

”تب تو یار ناگر۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہیں مر ہی جانا چاہئے۔“

”جج.... جی....“ ناگر چلتے چلتے رک گیا۔

”ہاں! تمہیں مر جانا چاہئے۔“

”لیکن....!“ وہ تھوک نکل کر بولا۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں مسٹر کیو سے بچاؤں گا۔ لہذا میں اسی وقت تمہیں

دوبارہ بچاؤں گا۔ لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تمہیں زندہ رہنے دوں گا۔“

ناگر کے منہ سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے اُسے فرنگی ہو۔

”چپ رہو گھاگس....!“ حمید اس کی پیٹھ پر گھونسا جھاڑ کر بولا۔

”میں مر جاؤں گا۔“ ناگر نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔

”اچھا! تو لڈو بانٹنے کی بات ہو رہی تھی۔“ حمید نے بڑے بے دردی سے قبضہ لگایا۔ ”ظاہر

ہے کہ مارے جاؤ گے تو ضرور مر جاؤ گے۔“

”مجھے معاف کر دیجئے۔“ ناگر گھگھکیا کر بولا۔

”ابھی نہیں! مر جاؤ گے تب۔“ حمید نے جھاڑ کر کہا اور فریدی ہنسنے لگا۔

”واقعی تم بڑے ڈرپوک ہو۔“ فریدی اس کا شانہ تھپکتا ہوا بولا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ مسٹر کیو

جیسے محتاط آدمی نے تمہیں کس طرح اپنے گروہ میں شامل کر لیا تھا اور مجھے تو اب اس میں بھی شبہ

ہے کہ تم منشیات کی ناجائز تجارت کرتے رہے ہو۔ ایسے لوگ بھی تھوڑے کیا کافی دلیر ہوتے ہیں۔“
ناگر کچھ نہ بولا۔

”خیر میں تمہیں خود نہیں ماروں گا۔“ فریدی نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”تمہیں خود کشی کرنی پڑے گی۔“
”خود کشی۔“

”ہاں.... ظاہر ہے کہ مسٹر کیو نے تمہیں پتہ نائیز کر کے خود کشی ہی کے لئے بھیجا تھا اور اُس نے تمہارے پیچھے کسی کو لگا بھی دیا تھا جس نے اسے اطلاع دی کہ تم مرنے سے بچا لئے گئے ہو۔“
”پھر....؟“

”پھر یہی کہ تمہیں خود کشی کر ہی لینی چاہئے ورنہ مسٹر کیو کو بڑا دکھ ہو گا اور میں نہیں چاہتا کہ اس بے سہارا یتیم کا دل دکھے۔“

”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“ ناگر خوفزدہ آواز میں ہنسا۔

”ویسے! تم رہتے کہاں ہو۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہمیں جانا کہاں ہے۔“ حمید نے جھلا کر پوچھا۔

”بکو مت.... ہاں.... تم نے نہیں بتایا۔“

”پرنس لین میں۔“

”مالدار آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ فریدی نے کہا۔ پھر قدرے توقف سے پوچھا ”اور کون کون ہے تمہارے ساتھ۔“

”کوئی نہیں.... میں تنہا رہتا ہوں۔“

”تب خود کشی کے لئے گھر ہی مناسب رہے گا۔“

”نہیں! نہیں۔“ ناگر کانپتا ہوا بولا۔ ”میں بالکل ویسا ہی محسوس کر رہا ہوں.... دریا میں

کودنے سے قبل.... نہیں.... میں خود کشی نہیں کروں گا۔“

”کیا محسوس کر رہے ہو۔“ حمید نے پوچھا۔

”بالکل یہی کہ مجھے خود کشی کر لینی چاہئے۔ دریا میں کودنے سے قبل بھی یہی ایک خیال میرے ذہن میں تھا کہ مجھے دریا میں کود جانا چاہئے.... نہیں نہیں میں مرنا نہیں چاہتا۔“

”تم اپنے گھر میں خود کشی کرو گے۔“ فریدی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔
ناگر کے منہ سے ایک گھنی گھنی سی چیخ نکلی اور بیہوش ہو کر گر پڑا۔

خفیہ پیغام

تیسرے دن پرنس لین کی کوٹھی نمبر گیارہ میں ناگر کی اش پائی گئی۔ دہنی کپٹی پر گولی لگی تھی۔ پولیس کو اس نتیجے پر پہنچنا پڑا کہ وہ خود کشی کا کیس تھا۔ کیونکہ قریب پڑے ہوئے ریو اور کے دستے پر مرنے والے ہی کے انگلیوں کے نشانات ملے تھے۔ کوٹھی کی تلاشی لینے پر کافی مقدار میں کونین برآمد ہوئی اور پھر کچھ کاغذات بھی ملے۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مرنے والا بڑے پیمانے پر منشیات کا ناجائز لین دین کرتا تھا۔

کوٹھی کے باہر کافی بھیڑ تھی جس میں اخباروں کے رپورٹر بھی تھے۔ پولیس نے کسی کو بھی اندر نہیں جانے دیا۔ سر جنٹ حمید تھوڑی دیر تک کمرے والوگوں کی چھ میٹکونیاں سنتا رہا پھر وہاں سے چل پڑا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں اور آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشمہ.... لباس شکاریوں جیسا پہن رکھا تھا۔ اس نے ایک ٹیکسی کی اور پھر روزنامہ نیواسٹار کے دفتر کے قریب اتر گیا۔ دفتر کے سامنے والے ریسٹوران میں داخل ہو کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دوسرے کنارے پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے مسکرا کر اسے آنکھ ماری اور حمید تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

”کیا رہا؟“ اس آدمی نے پوچھا۔

”تمہاری خود کشی خاصی کامیاب رہی۔“ حمید بیٹھتا ہوا ہوا۔

ناگر ہنسنے لگا۔ اس کے چہرے پر بھی فریدی نے اپنی استاد کی دکھائی تھی۔ اتنا شاندار میک اپ تھا کہ خود ناگر ہی پہلے اجنبیہ میں پڑ گیا تھا۔

”کافی بھیڑ ہوگی۔“ ناگر نے پوچھا۔

”کچھ مت پوچھو تمہاری شادی پر بھی اتنے آدمی اکٹھا نہ ہوتے۔“

”لیکن اش کہاں ملی تھی۔“

”اوہ! یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔“ حمید اپنی نقلی مونچھوں کو ایٹھٹھا ہوا ہوا۔ ”سول ہسپتال سے ایک ادوارث مردہ لے کر اُس پر تمہارا میک اپ کر دیا گیا۔“

”لیکن... مردے میں خون کہاں سے آیا ہوگا۔“

”یاد تم ڈیوٹ ہو! ارے بکرے کا خون۔ ویسے تم بھی کسی بکرے سے کم نہیں ہو۔“ حمید نے کہا۔ ”اب تم خود کشی کی وجہ بھی پوچھو گے۔“

”یقیناً...!“

”تمہارے مسئلہ کو کو مطمئن کرنے کے لئے۔ ورنہ وہ تمہیں ہسپتال میں بھی نہ چھوڑتا۔“

”کوئی اور وجہ۔“ ناگرنے پوچھا۔ ”ظاہر ہے کہ آپ لوگوں کو مجھ سے ہمدردی نہیں ہو سکتی۔“

حمید تھوڑی دیر تک اُسے غور سے دیکھتا رہا پھر ہوا۔

”مجھے اب بھی تم پر شبہ ہے۔“

”کس بات کا۔“ ناگرنے چوک کر ہوا۔

”یہی کہ کہیں تمہاری کھوپڑی میں بھس کے بجائے عقل تو نہیں بھری ہوئی ہے۔“ حمید نے کہا اور اشارے سے ایک ویٹر کو بلا کر اس سے ہوا۔

”ایک کام کرو گے... اوہ اچھا... ٹھیک! یہ سامنے اخبار کا دفتر ہے نا! یہاں ایک مس رشید ہیں... جانتے ہو گلد... تو یہ لفافہ انہیں دے آؤ۔ کیا سمجھے؟“

حمید نے اس طرح اسے آنکھ ماری جیسے اس لفافے میں کوئی عشقیہ خط ہو۔

”اور یہ لو اپنا انعام۔“ اُس نے ایک روپیہ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ویٹر سلام کر کے چلا گیا۔

”کیوں اُستاد۔“ ناگرنے اپنی ایک آنکھ دبا کر مسکرایا۔

”ناگرنے...!“ حمید نے شبیدگی سے اُسے مخاطب کیا۔

”فرمائیے۔“

”تم نے کبھی عشق کیا ہے۔“

”کس سے۔“

”کسی سے۔“

”ہاں...!“ ناگرنے کچھ سوچتا ہوا ہوا۔ ”مجھے زندگی کے ہر حصے میں دولت سے مشق رہا ہے۔“

”دھت....!“ امید نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”تم فلسفی معلوم ہوتے ہو.... خیر.... تمہیں کنول نہیں پسند آئی تھی۔“

”دولت کسی ایک کنول کی پابند نہیں ہوتی۔“ ٹاکر مسکرا کر بولا۔ ”مگر وہ دوسری.... لڑکی میں اسے کبھی نہ بھلا سکوں گا۔“

”اوہو! بر سبیل تذکرہ.... یہ تو بتاؤ کہ اس رات کیا بجتے پہچان کر بے وقوف بنایا کیا تھا۔“
 ”قطعی....!“ ٹاکر سر ہلکا کر بولا۔ ”کنول تینتیں پہچانتی تھی۔ اس نے تو یہاں تک بتا دیا تھا کہ وہ کیڈ یا ایک مسٹر فریدی کی تھی۔ حمید صاحب! میرا خیال ہے کہ کنول اس گروہ کے بہترین دماغوں میں سے ہے اور اس حبشی کی تو اس سے روح فگار ہتی ہے۔“

”بے زور دار....!“ امید نے اپنے پانپ میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔
 ”دنیا کی مکار ترین لڑکی کہہ لو۔“ ٹاکر بولا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر ٹاکر ہی بولا۔
 ”اب ہمیں کیا کرنا ہے۔“

”ہدایات کا انتظار۔“

”مسٹر فریدی کہاں ہوں گے۔“

”خدا ہی جانتے! تمہارے مسٹر کیونہی دانتوں پیدہ نہ آجائے گا۔“

”میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔“ ٹاکر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”لیا یہ کم حیرت انگیز ہے کہ میں نے خود کشی بھی کر لی ہے اور زندہ بھی ہوں۔ میری جگہ دراصل نیل نائٹ میں ہونی چاہئے تھی۔ لیکن محکمہ سرانج رسانی کے ایک آفیسر کے ساتھ بیجا ٹپیں مار رہا ہوں۔“

”شش....!“ حمید نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کی نظریں دروازے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جہاں لراٹم رپورٹر انور اور محکمہ سرانج رسانی کا پوز سائپلر آف داخل ہو رہے تھے۔ انور ایک جواں سال خوبصورت، ذہین مگر لا پرواہ آدمی تھا۔ بظاہر قوانین معمولی کراٹم رپورٹر تھا۔ لیکن شہر میں رونے والے جرائم سے اس کا تھوڑا بہت تعلق ضرور ہوا کرتا تھا۔ لیکن اتنا ہوشیار تھا کہ قانون کی گرفت میں آنے سے قبل ہی لوٹی یا تھوڑا کچھ لالچ لے لیتا۔ الٹ ہو جاتا۔ محکمہ کے آفیسروں میں فریدی کے علاوہ اور کسی سے نہیں دیتا تھا۔ فخر یہ کہتا تھا کہ میں فریدی کا ہٹلر د

ہوں رشیدہ اس کی دوست تھی۔ دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے اور ایک ہی فلیٹ میں رہتے تھے۔ رشیدہ کافی حسین مگر مضبوط اعضاء کی لڑکی تھی۔ چال ڈھال میں نسوانیت کی بجائے واضح قسم کی مردانگی رکھتی تھی۔

انسپکٹر آصف محکمہ سراغ رسانی کے ان آفیروں میں سے تھا جو عموماً دوسرے کے کاندھے پر رکھ کر بدوق چلانے کے قائل تھے۔ اس پر جب بھی کوئی آفت آتی وہ انور کے پیچھے لگ جاتا۔ اُس سے مدد کا طالب ہوتا، کبھی خوشامدیں کرتا اور کبھی دھونس دھڑلے سے کام نکالنے کی کوشش کرتا۔ انور اُسے عموماً ”بوڑھے بیٹے“ کہہ کر مخاطب کرتا۔ وہ تینوں حمید اور ناگر کے قریب ہی ایک خالی میز پر آ بیٹھے۔

انور آصف سے کہہ رہا تھا۔ ”چلو جلدی سے آرڈر پلیس کرو۔“
 ”تم ہمیشہ گردن ہی کاٹنے کی فکر میں رہتے ہو۔“ آصف ہنس کر بولا۔ ”خیر.... بوائے۔“
 اس نے ویٹر کو بلا کر تین آدمیوں کے لئے لچ کا آرڈر دیا۔
 ”ہوں.... اب کہہ چلو۔“ انور رشیدہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔
 ”ظاہر ہے کہ تم اس موقع پر نچلے نہ بیٹھو گے۔“ آصف نے کہا۔ ”میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ اگر مجھ سے مل کر کام کرو تو کیا حرج ہے؟“

”چلو منظور ہے۔ میں مرتے دم تک تم سے مل کر کام کرتا رہوں گا۔ کام بھی تو بتاؤ۔“
 ”اڑنے لگے آخر! میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔“
 ”خیر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔“ انور مسکرا کر بولا۔
 ”آخر وہ رائفل.... کس کی ہو سکتی ہے۔“ آصف نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”میری ہی ہے۔“ انور نے سنجیدگی اور لاپرواہی سے کہا۔
 ”پھر وہی۔“ آصف بڑبڑا کر بولا اور رشیدہ ہنسنے لگی۔
 حمید اور ناگر آکس کریم کھانے میں مشغول تھے۔

”تمہارے استاد۔“ آصف تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ ”تو نہ جانے کس چوہے کی بل میں

جا گھسے ہیں۔“

”اور آخر میں یقیناً ایسی بات ہی کی سونڈ پکڑے ہوئے برآمد ہوں گے۔“ انور بولا۔

”ہو نہہ۔۔۔!“ آصف نے بُرا سامنہ بنایا۔

ویٹر نے کھانا میز پر لگا دیا تھا۔

”بہر حال تم اطلاعات چاہتے ہو۔“ انور نے کہا۔ ”لہذا سب سے بڑی اطلاع یہ ہے کہ ابھی

تک میں تو خود ہی اندھیرے میں ہوں۔“

”میں اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔“

”تم تو شاید اسے بھی تسلیم نہ کرو کہ بعض اوقات تم بڑے حسین معلوم ہوتے ہو ویسے

برسبیل تذکرہ میرے پاس سگریٹ بھی نہیں ہیں۔“

”تم ڈاکو ہو۔“ آصف بگڑ کر بولا۔ ”میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں۔“

”کیوں! کیا اب اس فیشن ایبل بوڑھی عورت سے کچھ نہیں ملتا جس نے مارٹن روڈ پر فتنہ

خانہ کھول رکھا ہے۔“

آصف تھیر آ میز نظروں سے انور کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر کچھ بڑبڑاتے ہوئے اس نے جیب

سے پرس نکالا۔

انور نے ویٹر کو آنکھ کے اشارے سے بلا کر آہستہ سے کہا۔ ”اسٹیٹ ایکسپریس کے دو ٹکن۔“

”دو نہیں ایک۔“ آصف جھا کر بولا۔

”اس عورت کے پاس ایک لڑکی بھی۔۔۔!“

آصف نے انور کو جملہ نہ پورا کرنے دیا۔ دس کا ایک نوٹ نکال کر ویٹر کے ہاتھ میں تھماتا

ہوا جلدی سے بولا۔ ”چلو بھاگ کر جاؤ دو ہی لانا۔“

پھر وہ قبر آلود نظروں سے انور کو گھورنے لگا۔ رشیدہ دوسری طرف منہ پھیر کر مسکرا رہی تھی۔

”آج کل میں بڑی پریشانیوں میں مبتلا ہوں۔“ انور سر جھکائے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ ”فلیٹ کا

تین ماہ کا کرایہ چڑھ گیا ہے۔ لائڈری والے نے تقاضوں کی بھرمار کر رکھی ہے۔ رشیدہ کا الگ

قرض دار ہوں۔“

”یار تم کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔“ آصف بے بسی سے بولا۔

”صرف دو سو روپے مجھے بطور قرض دے دو۔“ انور اسی طرح سر جھکائے ہوئے بولا۔ ”پانی

پانی ادا کر دوں گا۔“

”میں کوئی قارون ہوں۔“ آصف نے جہاں کر کہا۔

”خیر نہ دو۔“ انور نے معصومیت سے کہا۔ ”ویسے میں دوسرا طریقہ بھی اختیار کر سکتا ہوں۔“
”تم کچھ نہیں کر سکتے۔“ آصف بھڑک اٹھا۔

”یہ تو تم سچ کہہ رہے ہو۔“ انور نے ٹھنڈے پانی کا گلاس چڑھا کر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
سگریٹ آگنے اور ویٹر میز صاف کر کے چلا گیا۔ آصف انور کو بدستور گھورتا رہا۔
”تم خود کو نہ جانے کیا سمجھنے لگے ہو۔“ اس نے کہا۔

”ایک ایسا یتیم جو قطعی بے سہارا ہو۔“ انور مسمی صورت بنا کر بولا۔

آصف کی جہانٹ اور بڑھ گئی اور وہ رشیدہ کی طرف مڑ کر بولا۔

”تم بھی نہیں سمجھتا میں اسے! مجھے یقین ہے کہ کسی دن بڑی مصیبت میں پھنس جائے گا۔“
”کبھی کبھی سمجھا دیا کرو بھی۔“ انور نے سنجیدگی سے کہا اور رشیدہ ہنس پڑی۔

آصف بل ادا کر کے اٹھنے لگا۔

”تو تم میری مدد نہیں کرو گے۔“ انور نے کہا۔

”نہیں.... نہیں.... نہیں۔“

”خیر اب اس عورت کی خیر نہیں.... اور جو کچھ بھی بیان وہ عدالت میں دے گی ظاہر ہے۔“

”تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔“

”جتنی بھی طرح دیتا ہوں اتنا ہی تم سر پر چڑھتے ہو۔“

”خیر اگر میں سر پر چڑھا ہوتا تو تم ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور اوتھڑوں کا ڈھیر ہوتے۔“

”آخر تم چاہتے کیا ہو۔“ آصف ایک جھٹکے کے ساتھ بیٹھتا ہوا بولا۔

”تم میری مدد کرو! میں تمہاری مدد کروں گا اور ساتھ ہی دعا کروں گا کہ خدا میرا اور تمہارا

بیڑا پار کر دے۔“

”تم مجھ سے ایک جہ بھی نہیں لے سکتے۔“

”تمہاری مرضی! میں زبردستی کا قائل نہیں۔“ انور نے آہستہ سے کہا اور اس کے چہرے پر

فرشتوں کی سی معصومیت نظر آنے لگی۔

”اچھا پچھلے ہی مہینے میں مجھ سے ڈھائی سو لے چکے ہو۔“

”یہ بھی تو سوچو کہ تم نے پچھلے مہینے میں لوہے کی چور بازاری کے سلسلے میں ڈیڑھ ہزار کمائے تھے۔“

”آہستہ بولو۔“ آصف ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ ”عجیب انگو آدمی ہو۔“

”بہر حال اگر تم نے ڈیڑھ ہزار میں سے ڈھائی سو نکال دیئے تو کون سا بڑا کمال کیا۔“

”میں ایک پائی بھی نہ دوں گا۔“

”مانگتا کون ہے تم سے۔“ انور بھی بگڑ کر بولا۔ ”میں براہ راست اسی سے معاملہ طے کر لوں گا۔“

”کیا...!“ آصف اچھل کر بولا۔ ”تم اس سے بات بھی نہیں کر سکتے۔“

”بات!“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”میں اسے فلمی گیت تک سناؤں گا۔“

”خیر دیکھ لوں گا۔“

”تمہاری آنکھیں کمزور معلوم ہوتی ہیں۔ چشمہ لگا کر دیکھنا۔“

”اچھا...!“ آصف دانت پیٹتا ہوا بولا۔ ”دیکھا جائے گا۔“

وہ تیزی سے ریسٹوران سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد ہی ناگر اور حمید بھی اٹھ گئے۔

رشیدہ انور کو مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”تم کسی دن ضرور پھنسو گے۔“ اس نے کہا۔

”شکار نکل گیا۔“ انور ہاتھ ملاتا ہوا بولا۔

”ہر مہینے تو لوٹتے ہو! غریب کو۔“

”غریب کہتی ہو۔ اس لکھ پتی کو۔ اس سے بڑا راشی شاید پورے محکمے میں کوئی نہ ہو۔“

”حالت تو چماروں جیسی بنائے رکھتا ہے۔“

”نوابی لڑکے گردن تھوڑا ہی کٹوائے گا۔“ انور بولا۔

”ابھی ابھی فریدی صاحب کا خط ملا۔“ رشیدہ نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”کیا لکھا ہے؟“

”جیمس اینڈ جعفری کی فرم کے لئے ایک لیڈی اسٹینو ٹائپسٹ کی جگہ نکلی ہے! آج ہی انٹرویو!

فریدی صاحب نے لکھا ہے کہ میں انٹرویو میں جاؤں۔“

”تو گویا... وہ چاہتے ہیں کہ تم اس فرم میں ملازمت کر لو۔“

”اور کیا....؟“

”میرے لئے کچھ نہیں لکھا۔“

”نہیں.... بہت ممکن ہے کہ آگے چل کر تم بھی جھونکے جاؤ۔“

”شاید یہ میرے لئے پہلا اتفاق ہے کہ شہر میں ہونے والے کسی جرم کے متعلق لاعلم ہوں۔“
رشدہ کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”اوہ....!“ انور پر خیال انداز میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ وہی رافیل والا چکر ہے۔ وہ

میں کہاں۔ یہ سب کچھ نہیں لکھا۔“

”خط کس سے ملا۔“

”میں کے ایک ویٹر سے۔“

”ہوں۔ میرا خیال ہے کہ فریدی صاحب کے ہاتھ کوئی کڑی آگنی ہے۔ اسی لئے ان پر حملہ

بھی ہوا تھا۔“

”ہو سکتا ہے.... وہ مائیکروفون والا معاملہ بھی معمولی نہیں تھا۔“

”اور شاید وہی حملے کا باعث بھی تھا۔ فریدی صاحب کے اس انکشاف نے اس عجیب و

غریب اسلحے کو قریب قریب بیکار ہی کر دیا۔“

”سر جٹ حمید کا بھی کہیں پتہ نہیں۔“ رشدہ بولی۔

”ساتھ ہی ہو گا۔“

”اچھا تو اب وقت ہو رہا ہے.... میں چلی۔“ رشدہ کلائی کی گھڑی دیکھ کر اٹھتی ہوئی بولی۔

”کچھ پیسے ہیں تمہارے پاس۔“ انور نے کہا۔ ”تنخواہ پر لے لینا۔“

”ایک پائی بھی نہیں.... میں نہیں دے سکتی۔“

”نہ جانے کیوں آج بہت حسین لگ رہی ہو۔“

”نہیں میں حبش ہوں۔“ رشدہ نے منہ بنا کر کہا اور باہر نکل گئی۔

انور انتہائی تلخی سے ہونٹ سکوڑے ہوئے سیٹی بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ڈراؤنا آدمی

جیمس اینڈ جعفری کا دفتر رحمن لاج کے تین چار فلینوں پر مشتمل تھا۔ شہر کی بڑی فرموں میں جیمس اینڈ جعفری کا بھی شمار ہوتا تھا۔ فرم کا ایک پارٹنر جعفری ہی اس کا جنرل منیجر بھی تھا۔ دوسرے حصے دار غیر ملکی تھے۔ جیمس سب سے بڑا حصہ دار اور ہالینڈ کا باشندہ تھا لیکن وہ یہاں نہیں رہتا تھا۔ اس کی یہاں کی تجارت کی دیکھ بھال اس کا مختار مسٹر ہر شفیلد کرتا تھا۔ وہ بھی ہر ماہ کے اختتام ہی پر دفتر میں آتا تھا۔ مختصر یہ کہ فرم حقیقتاً جعفری ہی کی کارکردگی کی بناء پر چل رہی تھی۔ جعفری کے کمرے کے سامنے ایک بڑا کمرہ تھا جس میں اس کی سیکریٹری راحیلہ بیٹھتی تھی اور شاید یہی کمرہ ملاقاتیوں کے لئے بھی تھا۔ حالانکہ انٹر ویو کا وقت دو بجے تھا لیکن نو ہی بجے سے امیدوار آنے لگی تھیں۔ دو بجتے بجتے تو خاصی بھیڑ ہو گئی۔ ان میں سبھی نوجوان اور قبول صورت تھیں۔ جو نہیں بھی تھیں انہوں نے بننے کی کوشش کی تھی۔ انہیں میں رشیدہ بھی نظر آرہی تھی۔ ابھی تک اس کا نمبر نہیں آیا تھا۔ انٹر ویو کے لئے اندر جانے سے پہلے ہر لڑکی اپنے پرس سے چھوٹا سا آئینہ نکال کر اپنے بالوں اور چہرے پر تنقیدی نظریں ضرور ڈالتی تھی۔ بعض تو ہونٹوں پر لپ اسٹک کی نئی تہہ چڑھانے لگتیں۔ رشیدہ نے اپنا پرس ٹٹوا لیکن اس میں کیا تھا۔ انور اسے ایک کنگھانک تو رکھنے نہیں دیتا تھا۔ لپ اسٹک تو خیر اس نے برسوں سے نہیں استعمال کی تھی۔ انور کا قول تھا کہ لپ اسٹک لگانے سے حسن کی عصمت دری ہو جاتی ہے اور چہرے سے فاحشہ پن نکلنے لگتا ہے۔ البتہ ہلکے سے پاؤڈر اور اتنے ہلکے سے روج پر کہ سرخی قدرتی معلوم ہو اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

ابھی کئی لڑکیاں باقی تھیں کہ سیکریٹری نے آکر رشیدہ کا نام لیا۔

رشیدہ لاپرواہی سے اٹھی اور اس کے ساتھ ہوئی۔ سیکریٹری نے دروازہ کھولا اور رشیدہ جنرل منیجر مسٹر جعفری کے کمرے میں داخل ہوئی۔

دوسرے اور خوفناک آنکھیں اس کی طرف انہیں اور رشیدہ کانپ گئی۔ بھاری ججزوں اور تیکھے خدو خال کا ایک ڈراؤنا آدمی اُسے گھور رہا تھا۔ اس کے شانے کافی چوڑے اور بھرتے ہوئے تھے۔ پیشانی اونچی اور بال گھونگھریالے تھے لیکن نہ جانے کیوں ان میں کوئی دلکشی نہیں تھی۔

”آہم....!“ اس نے غرا کر سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

رشیدہ بیٹھ گئی۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کا حلق خشک ہونے لگا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جسم کا ریشہ ریشہ کانپ رہا ہو۔

”آہم.... نام....!“ وہ غرایا۔

”رشیدہ....!“ وہ سر جھکائے ہوئے بولی۔

”تعلیم....!“

”پچلر آف آرٹس۔“

”ٹائٹنس، گریجویٹ کہو.... لڑکی بھی پچلر.... ایسے ڈ۔“

”گریجویٹ....!“ رشیدہ گھبرا کر بولی۔

”لپ اسٹک کبھی نہیں استعمال کرتیں یا آج ہی نہیں کی۔“

”کبھی نہیں۔“

”گڈ....!“

پھر اس نے اپنی سیکرٹری کی طرف مڑ کر پوچھا۔ ”کوئی اور بھی ایسی ہے جس نے لپ اسٹک نہ لگا رکھی ہو۔“

”جی نہیں۔“ سیکرٹری کی کپکپائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

”سب کو رخصت کر دو۔“ وہ غرایا۔ ”اور اگر تم نے بھی اس کا استعمال ترک نہ کیا تو تمہیں

بھی رخصت کر دیا جائے گا.... سمجھیں۔“

”جی ہاں۔“ وہ مری ہوئی آواز میں بولی اور باہر چلی گئی۔

”ڈکٹیشن....!“ اس نے رشیدہ کی طرف کاغذ اور پنسل سرکاتے ہوئے کہا۔

رشیدہ کا ہاتھ کانپ رہا تھا لیکن وہ پنسل پکڑ کر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بول رہا تھا اور رشیدہ کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی سر

اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ایک بار بھی اس سے نظریں چار

ہو گئیں تو وہ ہمسائی اور ذہنی دونوں حیثیتوں سے بیکار ہو جائے گی۔

”بس....!“ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”جاؤ اسے کانپ کر دو۔“

رشیدہ کمرے سے چلی آئی۔ بڑے کمرے میں سیکریٹری کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنی میز پر سر او نہاٹے بیٹھی تھی اور اس کے جسم کی متواتر جنبشوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سک سک کر رو رہی ہے۔ رشیدہ چپ چاپ بیٹھ کر ٹائپ کرنے لگی۔ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ فریدی نے کہاں پھنسا دیا۔

تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجی اور سیکریٹری اچھل کر سیدھی ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی اپنی آنکھیں خشک کیں لباس درست کیا اور اندر چلی گئی۔ رشیدہ نے محسوس کیا کہ اس نے اپنے ہونٹ صاف کر ڈالے ہیں۔

رشیدہ ٹائپ کر چکنے کے بعد انتظار کرتی رہی۔ سیکریٹری اندر تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ اتنی دیر تک ٹنول ٹنول کر ٹائپ کرتی رہی ہے لیکن اس کی بھی ہمت نہیں تھی کہ جعفری کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتی۔

جیسے ہی سیکریٹری کمرے سے نکلی وہ کھڑی ہو گئی۔

”ہو گیا۔“ رشیدہ آہستہ سے بولی۔ سیکریٹری نے سر کو خفیف سی جنبش سے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور اپنی میز پر بیٹھ گئی۔

رشیدہ اندر چلی گئی۔

”آہم.... سٹ ڈاؤن۔“ جعفری غرایا۔

رشیدہ نے بیٹھتے ہوئے شیٹ اُس کی طرف بڑھادی۔

”ٹھیک! پہلے کہاں کام کیا ہے۔“

”نیو اسٹار کے دفتر میں۔“

”وہاں سے کیوں چھوڑا۔“

”زائد شاف میں تھی۔“

”آہم! کتنی تنخواہ تھی۔“

”ڈھائی سو۔“

”لیکن یہاں صرف دو سو ملیں گے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ رشیدہ آہستہ سے بولی۔

”گذا!“ اس نے گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک کر کہا۔ ”ایک بات اور.... تم اپنے کام سے کام رکھو گی۔ وہ بات جس سے تمہیں کوئی سروکار نہ ہو اپنی دلچسپیوں کی لسٹ پر نہیں لاؤ گی۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”آہم.... کچھ نہیں.... بس۔“ اس نے گھنٹی بجائی اور سیکریٹری پھر اندر آ گئی۔

”انہیں کام بتاؤ۔“ اس نے ایک کاغذ پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

سیکریٹری رشیدہ کو لے کر بڑے کمرے میں چلی آئی۔ اس کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں اور ناک کے تنھنے سرخ ہو گئے تھے۔ اس نے ایک فائل نکال کر رشیدہ کے سامنے ڈال دیا۔

”تاریخ وار ناپ کرتی جاؤ۔ ایک ایک نقل بھی ہو گی۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

رشیدہ صرف اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ ویسے وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ فائل سے کاغذات نکال کر ناپ کرنے بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد جعفری اپنے کمرے سے نکل کر ان کی طرف دھیان دیئے بغیر باہر چلا گیا۔ اس کے جوتوں کی چڑچڑاہٹ کافی دیر تک سنائی دیتی رہی۔

رشیدہ ناپ کر رہی تھی لیکن اس کا ذہن اسی عجیب و غریب آدمی میں الجھا ہوا تھا اور اس کی سیکریٹری راحیلہ تو اس سے بھی عجیب تر معلوم ہو رہی تھی۔ یہ ایک دہلی پتلی سی کافی خوبصورت لڑکی تھی۔ آنکھیں بڑی اور پلکیں گھنیری تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہر وقت کسی انجانے نشے سے بوجھل رہتی ہوں۔ رشیدہ نے اسے آفس میں روتے دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اگر اپنے مالک کا رویہ اپنے لئے توہین آمیز سمجھتی ہے تو یہاں کیوں پڑی ہوئی ہے جعفری جیسا وحشی بھی آج تک اس کی نظروں سے نہیں گذرا تھا۔ اس نے اس غریب لڑکی سے کتنی بے دردی سے باتیں کی تھیں۔ شاید وہ عورت کا احترام کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔

رشیدہ سوچتی رہی اور اس کی انگلیاں تیزی سے Key Board پر چلتی رہیں۔ اس نے یہ تک نہ محسوس کیا کہ راحیلہ اس کے قریب ہی آکر بیٹھ گئی ہے۔

”کیا تمہیں کہیں اور ملازمت نہ ملتی۔“ اس نے رشیدہ کو مخاطب کیا اور رشیدہ چونک پڑی۔

”ملازمت کہاں ملتی ہے آج کل۔“ رشیدہ منہ بنا کر بولی۔

”وہی تین ہفتوں میں تمہارے گالوں کی ہڈیاں ابھر آئیں گی۔“

”کیوں....!“

”اوہ! کیا تم نے کچھ نہیں محسوس کیا۔“ وہ ہڈیانی انداز میں بولی۔ ”کیا وہ آدمی ہے درندہ....“

وحشی....!“

”لیکن.... یہی میں بھی سوچ رہی تھی کہ آخر تم....!“

”میں....!“ وہ رشیدہ کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں مجبور ہوں۔ میری ایک اندھی بیوہ ماں

ہے چھ بھائی بہن ہیں۔ وہ سب چھوٹے ہیں۔ اگر میں یہاں ملازمت ترک کر دوں تو ان کا کیا ہو گا۔

مجھے یہاں تین سو روپے ملتے ہیں۔ زہر کی تین سو بوندیں، تین سو خنجر، جو چاہو سمجھ او۔“

”یہ ہمیشہ ایسا ہی رہتا ہے۔“ رشیدہ نے پوچھا۔

”ہمیشہ.... تم ہر وقت یہی محسوس کرو گی کہ تم پر ایک سانپ پھن اٹھائے مسلط ہے معلوم

نہیں کب ڈس لے۔“

”تم یہاں کب سے ہو۔“

”ڈیڑھ سال سے.... اور یہ ڈیڑھ سال ایسے معلوم ہوئے ہیں جیسے ڈیڑھ ہزار برس گزر گئے

ہوں۔“

”اس فرم کی خاص تجارت کیا ہے۔“

”لوہے کا سامان، سمندر پار کی ادویات، چمڑہ اور بھی کچھ ایسی چیزیں جن کیلئے خاص اسٹاف ہے۔“

”بزل فیجر کا قیام کہاں ہے۔“

”خدا ہی جانے۔“

”کیوں؟“ رشیدہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”وہ انیک قطعی غیر سوشل آدمی ہے۔ کم از کم میں تو قطعی نہیں جانتی کہ وہ کہاں رہتا ہے اور

اس کی کیا مشغولیات ہیں۔“

”بیوی بچے ہیں۔“ رشیدہ نے پوچھا۔

”بیوی بچے۔“ زاحیلہ زہر خند کے ساتھ بولی۔ ”جانوروں کے بیوی بچے نہیں ہوا کرتے۔“

دور کہیں جو توں کی چڑچڑاہٹ سنائی دی اور زاحیلہ اچھل کر اپنی میز پر جا بیٹھی۔ رشیدہ

انگلیاں Key Board پر دوڑنے لگیں راحیلہ گھبراہٹ میں ایک فائل الٹ رہی تھی۔ جوتوں کی چڑچڑاہٹ قریب ہوتی جا رہی تھی اور پھر کمرہ گونجنے لگا۔ جعفری دونوں کی میزوں کے درمیان آکر رک گیا۔ دونوں اس طرح کام میں مشغول نظر آرہی تھیں جیسے انہیں اس کے آنے کی اطلاع ہی نہ ہو۔ البتہ راحیلہ کانپ رہی تھی۔

”آہم....!“ جعفری غرایا۔ ”غپیں لڑ رہی تھیں.... لڑکی۔“ اس نے رشیدہ کو مخاطب کیا۔
”تم ہی ہو.... لیکن.... آفس ٹائم میں.... صرف کام ہونا چاہئے۔“

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رشیدہ بدحواسی سے ٹائپ کرتی رہی۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی اس نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کی آواز اب تک اس کے سر میں دھمک پیدا کر رہی تھی اور راحیلہ تو بالکل پیلی پڑ گئی تھی۔

چار بجے پوری عمارت گھنٹیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ رشیدہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ راحیلہ فائلیں اٹھا اٹھا کر الماری بند کر رہی تھی۔ شاید یہ کام ختم ہونے کی گھنٹی تھی۔ رشیدہ بدستور ٹائپ کرتی رہی۔

”مشین بند کرو۔“ راحیلہ نے اس کے قریب آکر کہا۔

”یہ شیٹ تو نکال لوں۔“ رشیدہ بولی۔

”نہیں گھنٹی بجنے کے بعد کوئی کام نہیں کر سکتا۔“

”خیر اگر تم کچھ اور بھی سننا چاہتی ہو تو مجھے اعتراض نہیں۔“ راحیلہ نے منہ بنا کر کہا اور اپنا ہینڈ بیک اٹھانے لگی۔

”ٹھہرو۔“ رشیدہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے جلدی جلدی شیٹ ٹائپ رائٹر سے نکالا اور دوسرے کاغذات سمیٹ کر فائل میں رکھ دیئے۔

پھر وہ دونوں آفس سے نکل آئیں۔

”تو ہم گھرے دوست ہیں۔“ رشیدہ مسکرا کر بولی۔ ”آؤ چائے پیئیں۔“

”چائے۔“ راحیلہ کی آواز کھوئی کھوئی سی تھی۔ ”مجھے فوراً ہی گھر پہنچنا ہوتا ہے.... ماں اندھی ہے نا۔ دوسری بہنیں بھی چھوٹی ہیں۔ اگر میں تھوڑا بہت وقت تفریحات کے لئے وقف کر دوں تو.... مجھے دراصل یہاں سے جا کر کھانا تیار کرنا ہوگا۔“

”تو پھر مجھے اپنا گھر ہی دکھا دو۔“

”اوہ بڑی خوشی ہے۔“ راحیلہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”ضرور چلو، ماں بہت خوش ہوگی میرا کوئی دوست نہیں، مجھے جیسی مردہ دل سے کون دوستی کرے گا۔ آج کل دوستیاں تو عموماً کلبوں، باروں اور ریسٹورانوں تک محدود ہوتی ہیں۔ اوہ.... ابھی تک بس نہیں آئی۔“

”ٹیکسی سے چلیں گے۔“ رشیدہ نے لاپرواہی سے کہا۔

”ٹیکسی....!“ راحیلہ نے اس طرح دہرایا جیسے رشیدہ نے ہوائی جہاز کہا ہو۔

”ہاں.... ہاں.... میرے پاس کافی پیسے ہیں۔ میں اکیلی ہی ہوں نا.... کافی پیسے بچتے ہیں۔“

”تم اکیلی ہو۔“ راحیلہ اسے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔

رشیدہ نے ایک ٹیکسی روکائی اور دونوں اس میں بیٹھ گئیں۔ پھر اس نے راحیلہ سے پتہ پوچھ کر شو فر کو بتایا اور ٹیکسی چل پڑی۔ راحیلہ اب تک رشیدہ کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”تمہارا کوئی مرد دوست نہیں۔“ رشیدہ نے پوچھا۔

”نہیں کوئی نہیں۔“ راحیلہ مضطربانہ انداز میں بولی۔ ”میں نے آج تک اس کی ہمت ہی نہیں کی۔“

”کیوں؟“

”میں اپنی ہی ذات سے بڑی خائف رہتی ہوں کہ میرے ہی جذبات مجھے تنکے کی طرح نہ جانے کدھر بہالے جائیں گے پھر میری اندھی ماں کا کیا بنے گا۔ میرے ننھے ننھے بھائی بہن۔“

راحیلہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے جنہیں وہ دوسری طرف منہ پھیر کر پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

رشیدہ کچھ نہ بولی اور اس لڑکی کی بیچارگی پر غور کر رہی تھی۔ دونوں خاموش تھیں۔

دفعۃً راحیلہ چیخ پڑی.... وہ سامنے ہی دیکھ رہی تھی۔

ٹیکسی کے ڈرائیور کی لاپرواہی تھی یا سامنے سے آنے والی کار میں بیٹھے ہوئے آدمی کی غلطی کہ دونوں کاریں بس ایک فٹ کے فاصلے پر رک گئیں۔ بریکوں کی آواز سنائی دی اور وہ دونوں اگلی سیٹ کی پشت سے ٹکرا گئیں۔

دوسرے لمحے میں انہوں نے غراہٹ قسم کی آواز سنی جو جنرل نیجر جعفری کی آواز کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی کار سے اتر کر سیدھا ٹیکسی کی طرف آیا کھڑکی کھولی اور

شو فر کو گریبان سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ اس نے ان دونوں کی طرف دھیان تک نہ دیا تھا۔
ڈرائیور کو دو تین ہاتھ جھاڑنے کے بعد وہ نہایت سکون سے اپنی کار میں جا کر بیٹھ گیا اور کار
چل پڑی۔

ڈرائیور کئی منٹ تک گالیاں بکتا رہا۔ ٹیکسی کے گرد اچھی خاصی بھیڑ اکٹھا ہو گئی تھی۔
”کیوں صاحب میری غلطی تھی۔“ وہ ٹیکسی میں بیٹھتا ہوا ان دونوں کی طرف مڑ کر بولا۔
”نہیں....!“ رشیدہ نے آہستہ سے کہا۔

”خیر سارے کو پھر کبھی دیکھ لوں گا۔ اُسے بھی یہیں رہنا ہے اور مجھے بھی۔“
ٹیکسی روانہ ہو گئی مگر ڈرائیور بدستور بڑبڑائے جا رہا تھا وہ کچھ اس قسم کی باتیں کر رہا تھا جیسے
شہر میں جتنے بھی قتل ہوتے ہیں اسی کے دم سے اور جتنی بھی بد معاشیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب
کا روح رواں وہی ہے۔ دنیا میں اب تک جتنے بھی سرکش گذرے ہیں انہیں اسی نے نچا دکھایا تھا۔
رشیدہ اور راحیلہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبانیں پھیر رہی تھیں۔

حمید کی شرارت

تقریباً آٹھ بجے رشیدہ راحیلہ کے گھر سے واپس آئی۔ راحیلہ کے متعلق اس نے اندازہ لگایا تھا
کہ وہ ایک سعادت مند بیٹی اور محنت کرنے والی بہن ہے۔ اگر کوئی اور موقع ہو تا تو وہ اس کی گھریلو
زندگی کے متعلق سوچ سوچ کر کافی دیر تک لطف اندوز ہوتی مگر اس کا ذہن تو اپنی فرم کے جنرل
منیجر جعفری میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اگر انسپکٹر فریدی نے اسے نہ بھیجا ہو تا تب بھی اور کسی موقع پر
اس کی شخصیت رشیدہ کے ذہن پر ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ضرور پیدا کرتی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ آخر اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے گی کیا وہاں کوئی
ایسا کام بھی ہو تا تھا جو کسی دوسرے کی کھوجی طبیعت میں بے چینی پیدا کر سکتا ہو۔

وہ فٹ پاتھ پر پیدل چل رہی تھی۔ دفعتاً اُس کے قریب سے گذرتے ہوئے دو آدمیوں نے
اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ وہ دہلی زبان سے اسی عجیب و غریب رائفل کا تذکرہ کر رہے
تھے جس نے پُر اسرار طریقے پر وزیر خزانہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ انداز گفتگو ایسا تھا جیسے

وہ اس کے متعلق کچھ جانتے ہوں اور ان آدمیوں سے بھی واقف ہوں جنہوں نے اسے استعمال کیا تھا۔

رشیدہ چپ چاپ ان کا تعاقب کرنے لگی کیونکہ وہ ان کی حقیقت سے ناواقف تھی۔ ان میں ایک سرجنٹ حمید تھا اور دوسرا ناگر، حمید نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی تھی۔ وہ ابھی تک شکاری ہی والے بھیس میں تھا اور اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ رشیدہ کو دیکھ کر اس کی رگ شرارت پھڑک اٹھی تھی اور اس نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے رائفل کا تذکرہ چھیڑا۔ دن بھر کی کوفت کے بعد وہ تھوڑی سی تفریح بھی کرنا چاہتا تھا۔ آج وہ اور ناگر ٹیلی فون ایکسچینج کے گرد منڈلاتے رہے تھے۔ ٹیلی فون ایکسچینج میں اسی دن محکمہ سرانج رسانی کے دو تین آدمی بحیثیت ٹیلی فون آپریٹرز داخل ہوئے تھے۔ انہیں فریدی کی طرف سے ہدایت ملی تھی کہ مسٹر کیو کے پیغامات پر نظر رکھیں اور انہیں نوٹ کر کے اس تک پہنچائیں۔ حمید دن بھر کی رپورٹ لے کر جا رہا تھا کہ رشیدہ نظر آگئی۔

حمید اور ناگر نے ایک ریسٹوران کارخ کیا۔ رشیدہ پیچھے لگی رہی وہ ان کے قریب ہی کی ایک خالی میز پر جا بیٹھی۔ حمید اور ناگر سرگوشیوں میں گفتگو کرتے رہے۔ بظاہر وہ رشیدہ کی طرف سے لاعلم نظر آرہے تھے۔

رشیدہ نے کافی منگوائی لیکن اسے پتہ نہیں کہ کب ختم ہوگئی۔ وہ دراصل ان کی گفتگو سننے کی کوشش کر رہی تھی۔

اپنی چائے ختم کرنے کے بعد حمید اور ناگر اٹھ گئے۔ رشیدہ کا شبہ یقین کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے جلدی سے بل ادا کیا اور باہر نکل آئی۔ دونوں فٹ پاتھ پر آہستہ چل رہے تھے۔ سڑک سے گذر کر وہ ایک گلی میں مڑ گئے۔ رشیدہ کافی فاصلے پر ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ نہ جانے کتنی پیچ در پیچ گلیوں سے اسے گذرنا پڑا۔ وہ دونوں کہیں رکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

وہ پھر ایک تاریک گلی میں مڑے اور رشیدہ جیسے ہی اس گلی میں داخل ہوئی اس نے محسوس کیا کہ دونوں کے قدموں کی آوازیں آنی بند ہو گئی ہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں گھور رہی تھی۔ دفعتاً کوئی ٹھنڈی سی چیز اس کی کینٹی سے آگئی۔

”خبر دار۔“ ایک سرگوشی سنائی دی۔ ”آواز نکلی اور کھوپڑی صاف۔ بغیر آواز کا ریوالتور

ہے.... آگے چلو... چلو....!“

اب ریوالور کی نال اس کی پیٹھ پر تھی اور وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔

”داسے مڑو.... چلتی رہو.... ٹھیک.... اب رک جاؤ۔“

تالے میں کنجی گھمانے کی آواز سنائی دی اور کوئی دروازہ چڑچڑاہٹ کے ساتھ کھلا۔ گلی میں عجیب طرح کی سیلی سیلی سی بدبو گونج رہی تھی۔

”چلو اندر چلو.... شابش۔“ سرگوشی پھر سنائی دی۔ حمید حتی الامکان اپنی آواز بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رشیدہ پر لے سرے کی چالاک اور ذہین ہے اگر پہچان گئی تو ساری تفریح کر کری ہو جائے گی۔ ان کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ پھر سوئچ اون کرنے کی آواز آئی اور راہداری روشن ہو گئی۔ رشیدہ نے خود کو انہیں دونوں کے درمیان میں پایا۔ گھنی مونچھ والے شکاری کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

”آگے بڑھئے.... محترمہ۔“ سرجنٹ حمید نے نہایت ادب سے کہا۔

”اس کا مطلب....!“ رشیدہ بگڑ کر بولی۔

”اندر لغت موجود ہے۔ مجھے مطلب زبانی نہیں یاد رہا کرتے۔“

”مجھے جانے دو.... ورنہ شور مچاؤں گی۔“

”اونچی سے اونچی عورت سے بھی میں یہی توقع رکھتا ہوں۔“ حمید لاپرواہی سے بولا۔ ”چلئے۔“

رشیدہ بے بسی سے چلنے لگی۔ وہ ایک کمرے میں آئے جہاں کئی پرانی اور زنگ خوردہ کرسیاں

پڑی ہوئی تھیں۔

”تشریف رکھئے۔“ حمید نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ رشیدہ بیٹھ گئی۔

”مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ میں آپ کو یہاں کس لئے لایا ہوں۔“ حمید نے ذہن پر زور دینے

کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا بیہودگی ہے۔“ رشیدہ بگڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”جاؤ ایک چہرہ تلاش کرو۔“ حمید نے ناگر کو مخاطب کر کے کہا۔ ناگر مسکراتا ہوا چلا گیا۔

”بیٹھے بیٹھے۔“ حمید رشیدہ کی طرف دیکھ کر خشک لہجے میں بولا۔ ”مجھے جو لڑکی پسند آتی ہے

اُسے میں اپنی پہلی فرصت میں ذبح کر ڈالتا ہوں۔“

رشیدہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

”اس لئے ذبح کر ڈالتا ہوں کہ وہ کسی اور کو نہ پسند آجائے۔“ حمید نے پھر کہا۔

”بکو نہیں! مجھے جانے دو۔“ رشیدہ جی کڑا کر کے بولی۔

”افسوس!“ حمید مغموم آواز میں بولا۔ ”میں سمجھا تھا کہ تم پہلی ہی نظر میں مجھ پر عاشق

ہو گئی ہو گی۔“

رشیدہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں وہ کسی پاگل کے ہتھے تو

نہیں چڑھ گئی۔ اتنے میں ناگر ایک بڑا سا چہرہ لے کر آگیا۔ حمید نے ہاتھ میں لے کر اس کی دھار

دیکھی پھر بگڑ کر بولا۔

”اس سے تو موم کی عورت بھی نہ ذبح ہو گی۔ جا کر تیز کرو۔“

ناگر چہرہ لے کر پھر چلا گیا۔

”جب سے تمہیں دیکھا ہے۔“ حمید سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھیکہ عشقیہ انداز میں بولا۔ ”دل کبھی

نیچے کبھی اوپر.... تمہارا خون کتنا لذیذ ہو گا۔ اور تمہاری بوٹیاں.... ہائے.... ہائے.... بغیر

ریشے کا گوشت.... ہولے ہولے احتیاط سے چباؤں گا۔ بوٹیاں دانتوں کے نیچے پھسلیں گی....

ہائے.... ہائے۔“

وہ اچھل اچھل کر زور زور سے سینہ پیٹنے لگا۔

رشیدہ کانپنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا لہرانے لگا۔

”سنتی ہو۔“ حمید نے پھر ہانک لگائی۔ ”تمہاری انگلیوں کی ہڈیاں.... ریلی ہڈیاں.... کرر

کرر چباؤں گا۔“

رشیدہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر

یہ پاگل ہے تو اس کا ساتھی تو پاگل ہو سکتا۔ کس دہال میں پھنس گئی۔

”ڈرو نہیں بھئی۔“ حمید بچوں کی طرح ٹھنک کر بولا۔ ”ڈر کر تم سارا مزہ کر کر اکر دو گی۔“

”مجھے جانے دو۔“ رشیدہ گھٹی گھٹی سی آواز میں چیخی۔

”اس مکان کی دیواریں خاص طور سے بنائی گئی ہیں۔“ وہ پُر سکون لہجے میں بولا۔ ”تم اچھی

طرح چیخ چیخ کر دیکھ لو کوئی جو مدد کو آئے۔ چلو تمہیں ان لڑکیوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں دکھاؤں جنہیں پہلے کھا چکا ہوں۔ ارے اب تو رال بھی ٹپکنے لگی۔ کہاں مر گیا۔ بھائی، اے کیا ابھی تک چہرہ ہی نہیں تیز ہوا۔“

”خدا کے لئے مجھے جانے دو۔“

”کیا تم نہیں چاہتیں کہ میں تمہیں کھا جاؤں۔“

”نہیں....!“ رشیدہ بوکھلا کر بولی۔

”اگر میں تمہیں چھوڑ دوں تو مجھے یاد رکھو گی۔“

”ہاں....!“ رشیدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور کیا سن رہی ہے۔

”تمہارا نام کیا ہے۔“

”رشیدہ....!“

”تب تو میں تمہیں ہر گز نہ چھوڑوں گا۔“

”کیوں....؟“

”رشیدہ جو نام ہے تمہارا۔ ہر وہ نام مجھے بہت پیارا لگتا ہے جس میں شین ہو رشیدہ.... ہائے۔“

وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر ہانک لگائی۔ ”اے تیز ہو گیا چہرا۔“

”تیز کر رہا ہوں۔“ کسی دوسرے کمرے سے آواز آئی۔

”جلدی کرو۔“

”نہیں.... نہیں....!“ رشیدہ گھگھکیائی۔

”ارے.... واہ.... یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ سب سے پہلے تمہارے ہونٹ کاٹوں گا پھر

گالوں کا گوشت اتاروں گا.... ہائے ہائے۔“

وہ کسی نیدے آدمی کی طرح منہ چلانے لگا۔

”بچاؤ.... بچاؤ۔“ رشیدہ زور سے چیخی۔

حمید ہنسنے لگا۔ دور کہیں بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی

جلدی جلدی زینے طے کر رہا ہو۔

”چپ رہو.... چپ رہو۔“ حمید دھیرے سے بولا۔ ”میرا باپ آرہا ہے۔“

”بچاؤ....!“ رشیدہ پھر چیخی۔

”عجیب احمق لڑکی ہو۔ خدا غارت کرے تمہیں۔ سارا مزہ کر کر کر دیا۔“

قدموں کی آوازیں نزدیک ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر ایک دروازہ کھلا اور رشیدہ کو انسپکٹر فریدی دکھائی دیا۔ وہ چیخ کر اس کی طرف جھپٹی اور قریب قریب اس پر گر پڑی۔

”بچائیے! بچائیے مجھے اس پاگل سے۔“

”پاگل....!“ فریدی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”جی ہاں.... پپ پاگل.... مجھے ذبح کرنا چاہتا تھا.... چھرا.... چھرا.... تیز ہو رہا ہے۔“

”سمجھا! ٹھہرو کہاں چلے۔“ فریدی نے حمید کو لاکارا۔

حمید رک گیا۔

”یہ کیا حرکت تھی۔“ فریدی اُسے گھورتا ہوا بولا۔ رشیدہ سیدھی کھڑی ہو گئی تھی حیرت سے کبھی حمید کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی فریدی کی طرف۔

”حمید! میں تم سے بچ چکے تھیں آگیا ہوں۔“

”حمید....!“ رشیدہ نے آہستہ سے دہرایا اور اس نے ہونٹ بھیجنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ حمید کی طرف بڑھی اور پھر اچھل کر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لئے دوسرے لمحے میں وہ اسے ایک صوفے پر گرائے اس پر چڑھی بیٹھی گھونٹوں اور تھپڑوں کی بارش کر رہی تھی۔ فریدی بے تحاشہ ہنس رہا تھا اور حمید ہنس تو وہ بھی رہا تھا لیکن رشیدہ کی چٹکیوں اور بوٹوں کی وجہ سے اس کی ہنسی میں کراہیں اور چیخیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ بدقت تمام فریدی نے انہیں الگ کیا۔ اس دوران ناگر بھی آگیا تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک چھرا دبا ہوا تھا۔

”ابھی تک میرا دل نہیں بھرا۔“ رشیدہ ہانپتی ہوئی بولی۔

”اور ابھی میری تھکن بھی دور نہیں ہوئی۔ انور واقعی بڑا خوش قسمت ہے۔“

”بے حیا۔“ رشیدہ نے بھنا کر کہا۔

”کسی عورت کے ہاتھ سے پٹنے میں بڑی لذت پائی جاتی ہے۔“

”اچھا تو ٹھہرو۔“ رشیدہ پھر بڑھی لیکن فریدی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر حمید سے کہا۔ ”اب میں

پیٹوں گا تمہیں۔“

”خدا کی قسم بڑی کوفت ہو گی مجھے۔“ حمید ڈھٹائی سے بولا اور ہنستا ہوا کمرے سے چلا گیا۔
 ”تم کیسے پھنس گئیں اس کے چکر میں۔“ فریدی نے پوچھا۔
 رشیدہ نے سارے واقعات دہرا دیئے۔

”عاجز ہوں اس سو سے۔“ فریدی نے کہا۔
 ”خیر میں بھی کسی موقع سے وہ مزہ چکھاؤں گی کہ یاد ہی کرے گا۔“
 ”بھئی ابھی نہیں.... بہت کام کرنا ہے۔“
 ”میں نے جیمس اینڈ جعفری میں ملازمت کر لی ہے۔“
 ”بہت خوب۔ جعفری کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرو اور ادھر ادھر بھی نظر رکھنا۔“
 ”کیا اس کا تعلق اسی راقفل....!“
 ”ہاں.... ہاں.... لیکن کسی کام میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں۔“
 ”وہ بڑا خوفناک اور پرلے سرے کا وحشی ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ فریدی پر خیال انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”تمہیں میری طرف سے براہِ ہدایات ملتی رہیں گی۔ جب ضرورت سمجھوں گا تو انور کو بھی شریک کر لوں گا ویسے اس کا خیال کیا ہے۔“
 ”کچھ بھی نہیں! وہ کہتا ہے کہ ابھی تک میں کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔“
 ”معاملہ ہی ایسا ہے۔“ فریدی نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اپنا صحیح نام ہی بتایا تھا۔“
 ”جی ہاں۔“

”ٹھیک ہے! میں سوچ رہا تھا کہ کہیں تم غلط نام نہ بتاؤ۔ اس طرح اسے شبہ ہو جاتا۔“
 ”تو کیا اس طرح شبہ نہ ہو گا۔“ رشیدہ نے کہا۔ ”شہر کے سارے جرائم پیشہ قریب قریب میرے اور انور کے نام سے تو واقف ہی ہیں۔“

”فکر مت کرو۔ تم وہاں اکیلی نہیں ہو۔“ فریدی بولا۔ پھر اس نے حمید کو آواز دی۔
 حمید دانتوں میں پائپ دبائے ہوئے اس شان سے داخل ہوا جیسے کچھ دیر قبل اس نے کوئی بہت بڑا معرکہ سرانجام دیا ہو۔ رشیدہ کو بھی ہنسی آہی گئی۔
 ”رشیدہ کو گلی کے موڑ تک پہنچاؤ۔“ فریدی نے کہا۔
 ”میں خود چلی جاؤں گی۔“ رشیدہ دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

”ایسا بھی کیا۔“ حمید اس کے پیچھے چل پڑا۔ ناگر بھی اس کے ساتھ تھا۔
رشیدہ کو پہنچا کر دونوں لوٹے۔

فریدی کمرے میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ حمید کو دیکھتے ہی برس پڑا۔
”نہ موقع دیکھتے ہو نہ محل! آخر اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ گدھے کہیں کے!
شرم نہیں آئی پٹتے ہوئے۔“

”آپ کو آگئی.... یہی کافی ہے۔ میں اور آپ الگ تھوڑا ہی ہیں۔“ حمید جیب سے دن بھر
کی رپورٹ نکالتا ہوا بولا۔ ”مسٹر کیو کے نام کئی پیغامات تھے۔ نمبر انہیں ملا۔ نمبر ۲..... نہیں
ملا..... بہر حال دن میں تقریباً پچاس آدمیوں نے ”نہیں ملا“ کی ہانک لگائی۔ سبھوں نے پبلک ٹیلی
فون بوتھ استعمال کئے تھے۔ پیغام نمبر ۵۳..... سب ٹھیک ہے..... نمبر ۵۴..... دیکھ لیا جائے گا
نمبر ۱۵۵ انتظار ہو گیا..... نمبر ۶..... آج رات کو..... نمبر ۷..... بنگلہ خالی ہے! کوئی نیا نیچرا بھی
تک نہیں رکھا گیا۔“

”آخری پیغام.....!“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔ ”غالباً ڈاکٹر نارنگ کے متعلق ہے۔
”اوہ ٹھیک یاد آیا..... یہ تو بھول ہی گیا تھا۔“ حمید نے کہا۔ ”آج تین بجے شام کو کسی نے
ڈاکٹر نارنگ پر بھی حملہ کیا تھا..... حملہ آور پکڑا نہیں گیا۔“
”کہاں..... کس طرح۔“ فریدی چونک کر بولا۔

”بچ بازار میں..... مین روڈ پر..... وہ کار میں جا رہا تھا کہ کسی نے گولی چلائی لیکن وہ بچ گیا۔
شیشے کے کچھ ٹکڑے اس کے جسم پر لگے ہیں۔“

”اوہ.....!“ فریدی کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔

”ریمیش! جیون اور اختر!“ حمید بولا۔ ”جیمس اینڈ جعفری کے دفتر کی نگرانی کر رہے ہیں۔ آخر
انہیں وہاں کیوں لگایا گیا ہے۔ کیا وہی مسٹر کیو ہو سکتا ہے۔ جعفری ہے تو خوفناک۔ رشیدہ وہاں کیا
کرے گی۔“

”دیکھتے جاؤ۔“ فریدی نے کہا اور پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

ڈکٹا فون

مسٹر کیو کا مسئلہ ابھی تک فریدی اور حمید ہی تک محدود تھا یا پھر خود اسی کے گروہ والے اس نام سے واقف تھے۔ رشیدہ تک کو فریدی نے اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا اور اس کا محکمہ تو خیر اندھیرے میں تھا ہی۔ اس بار بھی اس نے حسب عادت محکمے کو اپنی مشغولیات کی باقاعدہ رپورٹ نہیں دی تھی۔ ڈی۔ آئی۔ جی تک کو اس کا علم نہیں تھا کہ فریدی کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ فریدی نے اپنے ماتحتوں میں سے پانچ چھ خاص قسم کے آدمیوں کو مختلف کاموں پر لگا رکھا تھا لیکن وہ بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں ہدایات کہاں سے مل رہی ہیں۔

بہر حال مسٹر کیو کا نام تاریکی ہی میں رہتا اگر واقعات نے دوسرا رخ اختیار نہ کر لیا ہو تا اور شاید اس واقعے کا ذمہ دار بھی فریدی ہی تھا کہ مسٹر کیو کو خود ہی اپنا نام ظاہر کر دینا پڑا۔ فریدی کو پہلے سے علم تھا کہ اس نام کو سیکرٹ سروس کے بعض ممبر استعمال کرتے رہے ہیں۔ لہذا حمید اور ناگر کے تجربات سامنے رکھ کر اس نے اس کے متعلق تفتیش شروع کر دی۔ ہو سکتا ہے کہ مجرم اس سے واقف ہو گیا ہو اور اس نے اب کسی قسم کی پردہ داری مناسب نہ سمجھی ہو۔

ناگر کی مصنوعی خود کشی والے دن کے بعد سے ٹیلی فون ایکسچینج میں مسٹر کیو کے نام کے پیغامات موصول ہونے بند ہو گئے تھے۔

جس دن ناگر کی مصنوعی خود کشی منظر عام پر آئی اسی دن ڈاکٹر نارنگ ایم۔ پی پر حملہ کیا گیا لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ اسی رات کو ایک دوسرا حادثہ ہوا۔ وہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے معمولی نہیں تھا۔ ڈاکٹر نارنگ ہی کے گروپ کے دو پارلیمنٹری ممبر اپنی قیام گاہوں پر قتل کر دیئے گئے۔ دوسری صبح کو ان کے سر جسموں سے الگ پائے گئے اور انتہائی کوششوں کے باوجود بھی اس قسم کے نشانات نہ مل سکے جن سے قاتلوں پر روشنی پڑتی۔

عوام میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی اور خواص کو تو ہر لحظہ ملک الموت کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ پہلے وزیر خزانہ انتہائی ہراساں طریقے پر قتل ہوئے پھر ڈاکٹر نارنگ پر شہر کی سب سے بھری ہڑی سڑک پر اعلانیہ حملہ کیا گیا اور اسی رات کو پارلیمنٹ کے دو اور ممبر قتل کر دیئے گئے لہذا خواص کی سراسیمگی لازمی تھی۔

حکمہ سراغ رسانی کی عمارت میں تو گویا زلزلہ آگیا تھا۔ آئی۔ جی سے لے کر معمولی سادہ لباس والے تک بوکھلا ہٹوں کا شکار نظر آرہے تھے۔ سارا عملہ آج پھر بڑے کمرے میں اکٹھا تھا۔ البتہ فریدی اور حمید موجود نہ تھے اور وہ پانچ مخصوص سادہ لباس والے بھی نہیں تھے جنہیں فریدی نے خود ٹریننگ دی تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی اور آئی۔ جی میں کسی خاص مسئلے پر بحث ہو رہی تھی کہ ایک کلرک نے آکر ڈی۔ آئی۔ جی کو مطلع کیا کہ اس کی فون کال ہے۔

ڈی۔ آئی۔ جی اٹھ کر چلا گیا تقریباً دو تین منٹ تک خاموشی رہی پھر ڈی۔ آئی۔ جی کی واپسی پر ایک انسپکٹر نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔
 ”ڈاکٹر نارنگ ایم پی کا فون تھا۔“ اُس نے آئی۔ جی سے کہا۔ ”کوئی خاص بات معلوم ہوتی ہے۔ مجھے بلایا ہے۔ آواز سے خوفزدہ معلوم ہوتے تھے۔“

”میرا خیال تو یہ ہے کہ اب یہ سب اپنی حفاظت کیلئے آدمی بھی مانگیں گے۔“ آئی۔ جی بولا۔
 ڈی۔ آئی۔ جی چند لمحوں بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر نارنگ اپنی شہری قیام گاہ کے کمرے میں بے چینی سے ٹھہل رہا تھا جیسے ہی ایک نوکر نے ڈی۔ آئی۔ جی کا ملاقاتی کارڈ لا کر دیا وہ خود ہی صدر دروازے تک دوڑا چلا گیا۔

”اوہ.... آپ آگئے شکریہ۔“ وہ ڈی۔ آئی۔ جی سے مصافحہ کرتے ہوئے مضطربانہ انداز میں بولا۔ ”چلے.... اندر چلے.... اوہ! میں اس تکلیف دہی کے لئے شرمندہ ہوں۔ میں خود بھی.... آپ تک پہنچ سکتا تھا مگر....؟“

وہ اُسے نشست کے کمرے میں لے آیا۔

”بیٹھے! بیٹھے۔ آپ جانتے ہیں کہ پرسوں مجھ پر حملہ ہو چکا ہے اور رات کو میرے دو ساتھی....!“ ڈاکٹر نارنگ تھوک نگل کر رہ گیا۔ پھر ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔ وزیر خزانہ بھی میرے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا۔ میری.... ہم لوگوں کی پالیسی سے تو پورا ملک واقف ہے....!“

”جی ہاں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی سر ہلا کر بولا۔ ”یہی تو باعث حیرت ہے سارے کے سارے مخلص اور بے ضرر محب وطن تھے۔“

”اور اب.... ایک ایسی بات ہوئی ہے۔“ ڈاکٹر نے خوف زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر مضطربانہ اٹھا اور دروازے تک گیا۔ ایک لمحہ ادھر ادھر دیکھتا رہا اور لوٹ کر آہستہ سے بولا۔ ”آج صبح مجھے ایک دھمکی آمیز خط ملا ہے کسی نامعلوم آدمی کی طرف سے۔“

اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکال کر ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف بڑھادیا۔ ڈی۔ آئی۔ جی لفافے سے خط نکال کر پڑھنے لگا۔ معمولی کاغذ پر ناپ کیا ہوا تھا۔

”ڈاکٹر نارنگ ایم پی.... خوش قسمت تھے کہ کل بچ گئے۔ بہر حال تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اپنا دیہی بگلہ ایک ماہ کے لئے بالکل خالی کر دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو وزیر خزانہ اور تمہارے دو ساتھیوں کا ہو چکا ہے۔ اگر تم اسے محض دھمکی سمجھو تو یہ تمہاری بھول ہوگی۔ اس سلسلے میں پولیس سے مدد لینا وقت کی بربادی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا۔ وزیر خزانہ کی موت ہزاروں کے مجمع میں ہوئی تھی تمہارے دونوں ساتھی بھرے پُرے گھروں میں مار ڈالے گئے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ کافی عقل مند آدمی ہو۔ اس لئے توقع ہے کہ حکم کے خلاف نہ کرو گے۔ فقط

مسٹر کیو۔“

”مسٹر کیو!“ ڈی۔ آئی۔ جی آہستہ سے بڑبڑایا اور جواب طلب نظروں سے ڈاکٹر نارنگ کی طرف دیکھنے لگا۔

”اب بتائیے میں کیا کروں۔“

”آپ کی حفاظت کا انتظام کیا جائے گا مگر یہ مسٹر کیو۔“

”میں نہیں جانتا یہ کون ہے۔“ ڈاکٹر نارنگ نے بے چینی سے کہا۔ ”لیکن کیا آپ کے

حفاظتی اقدامات مجھے بچا سکیں گے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی کے چہرے پر گہرے تفکر کے آثار تھے۔ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی نے آپ سے مذاق کیا ہو۔“

”مذاق! مجھ سے کون.... مذاق کرے گا۔ شاید آپ بھول رہے ہیں کہ پرسوں مجھ پر حملہ

”بھی ہو چکا ہے۔“

”تو سنئے! میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ چپ چاپ بنگلہ خالی کر دیجئے۔ کیا وہاں آپ کے

ملازمین ہیں؟“

”جی ہاں!“

”تو انہیں وہاں سے ہٹا دیجئے۔ بقیہ ہم دیکھ لیں گے اور آپ زیادہ تر گھری رہیں تو بہتر ہے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی تھوڑی دیر تک اسے تسلیاں دیتا رہا پھر وہ خط اس سے لے کر واپس آگیا۔

آئی۔ جی اس کا منتظر تھا۔ وہ دونوں اپنے مخصوص ریٹائرنگ روم میں چلے آئے۔

ان دونوں کے درمیان مسز کیو کی شخصیت زیر بحث تھی۔

”جہاں تک میرے علم میں ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی کہہ رہا تھا۔ ”یہ نام سیکرٹ سروس والے

استعمال کرتے ہیں اور اس کا علم میرے محکمے میں فریدی کو ہو تو ہو اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ

وہی ایک ایسا ہے جو متعلق اور غیر متعلق ہر بات پر نظر رکھتا ہے۔“

”لیکن سیکرٹ سروس والے....!“ آئی۔ جی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”اسی الجھن میں بڑی دیر سے مبتلا ہوں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بولا۔

”آخر یہ فریدی رپورٹ کیوں نہیں دے رہا ہے۔“ آئی۔ جی کے لہجے میں جھلکا ہوا تھا۔

”کبھی نہیں دیتا اور میرے خیال سے اچھا ہی کرتا ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ ”خصوصاً یہ

معاملہ تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جس میں انتہائی رازداری سے کام لیا جائے۔“

”میں اسے درست نہیں سمجھتا۔ رپورٹ تو اسے دینی ہی چاہئے۔“

”کون سمجھائے اُسے! زیادہ کہئے تو استعفیٰ تیار ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ محض فطری میلان کی بناء پر

اس محکمے میں آیا ہے۔ ورنہ خاندانی دولت اتنی کثیر رکھتا ہے جو کئی پشتوں کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔“

”کچھ بھی ہوا تو دوسری نہیں برداشت کی جاسکتی۔“ آئی۔ جی کی آواز غصے میں کانپ رہی تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”وہ جب بھی اس طرح غائب ہوا ہے کچھ نہ کچھ

کر کے ہی واپس آیا ہے۔ گارساں اسی والے کیس کو لیجئے۔“

”آپ خواہ مخواہ اُس کی طرف داری کر رہے ہیں۔“ آئی۔ جی بگڑ کر بولا۔

ڈی۔ آئی۔ جی کچھ نہ بولا لیکن اس کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

آئی۔ جی پھر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اردلی نے جتن ہٹا کر آپریشن روم کے انچارج کی آمد کی اطلاع دی۔

”بلاو...!“ آئی۔ جی بولا۔

آنے والے نے ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے ڈی۔ آئی۔ جی سے کہا۔ ”آپ کے نام ٹرانسمیٹر پر یہ پیغام موصول ہوا ہے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی نے کاغذ لے لیا۔ یہ پیغام محض اشاراتی الفاظ (Code Words) میں تھا۔ دفعۃً ڈی۔ آئی۔ جی کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوئی اور وہ دبے ہوئے جوش کے ساتھ بولا۔

”دیکھا آپ نے! ہمیں مسٹر کیو کے متعلق آج ہی معلوم ہوا ہے لیکن فریدی پہلے سے جانتا تھا۔“
”یعنی...؟“

”سنئے!“ ڈی۔ آئی۔ جی کاغذ پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ ”جناب والا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مسٹر کیو نے خود ہی اپنے کو ظاہر کر دیا اور یہ بات بھی آپ سے پوشیدہ نہ ہوگی کہ یہ نام سیکرٹ سروس کے پانچ ممبران استعمال کرتے تھے۔ جب مجھے پہلی بار مجرم مسٹر کیو کے نام سے آگاہی ہوئی تو میں نے سیکرٹ سروس والوں کی تلاش شروع کر دی میں نے ان کے ٹھکانے کا پتہ لگایا ہے۔ لیکن وہ خود نہیں ملے اور نہ ان کے ٹرانسمیٹر ہی کا سراغ مل سکا۔ ٹیلی فون ایکسیج میں بھی پرسوں رات سے اب تک مسٹر کیو کے نام کوئی پیغام نہیں موصول ہوا۔ حالانکہ پچھلاریکارڈ بتاتا ہے کہ ہر گھنٹے میں آٹھ دس پیغامات اس کے نام ضرور ہوتے تھے۔ آپ اس سلسلے میں سیکرٹ سروس کے ہیڈ کوارٹر سے گفت و شنید کیجئے۔ ویسے میں تو یہی سمجھنے پر مجبور ہوں کہ وہ پانچوں عرصہ ہوا ٹھکانے لگا دیئے گئے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی خاموش ہو کر فخریہ انداز میں آئی۔ جی کی طرف دیکھنے لگا۔
”ہوں...!“ آئی۔ جی نے اپنے ہونٹ بھیجنے لئے اور اس طرح اپنے جوتوں کی طرف دیکھنے لگا جیسے ان سے جواب طلب کر رہا ہو۔

”تو کوئی سیکرٹ سروس والوں کی آڑ میں یہ سب کچھ کر رہا ہے۔“ آئی۔ جی تھوڑی دیر بعد بولا۔

”اس کے علاوہ اور کیا سوچا جاسکتا ہے۔“

”پھر کیا کیا جائے۔“

”میرے خیال سے سیکرٹ سروس والوں کے ہیڈ کوارٹر سے تحقیق ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ آئی۔ جی نے کہا اور میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ چیر اسی اندر داخل ہوا۔

”آپریشن روم کے انچارج کو سلام دو۔“ آئی جی نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد انچارج آگیا۔

”یہ پیغام....!“ آئی۔ جی کاغذ اس کی طرف بڑھاتا ہوا ”سیکرٹ سروس کے ہیڈ کوارٹر کے

لئے.... جواب فوراً چاہئے۔“

آپریشن روم کے انچارج کے جانے کے فوراً بعد کئی منٹ تک خاموشی رہی پھر ڈی آئی جی بولا۔

”میرا خیال ہے کہ فریدی کسی سیدھے ہی راستے پر لگ گیا ہے۔“

”لیکن مجھے اس کا یہ رویہ قطعی پسند نہیں۔“ آئی۔ جی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ضروری نہیں

کہ وہ ہر معاملے میں دانش مند ہی ثابت ہو۔ اسے دوسروں سے بھی مشورہ کرنا چاہئے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی شاید بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔

”بات تو ٹھیک ہی ہے! اگر ہماری لاعلمی میں کسی مصیبت میں پھنس گیا تو ہمیں اطلاع تک نہ

ہوگی۔ خیر اگر مل گیا تو میں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔“

”سمجھاؤ نہیں بلکہ مجبور کرو۔“

”بہتر ہے۔“

وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ دونوں کے چہرے گہرے تفکر کا پتہ دے رہے تھے۔ دفعتاً

ڈی۔ آئی۔ جی چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

”یہ آواز کیسی تھی۔“ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑایا۔

”آواز کہاں....!“

”کچھ کھر کھر سی تھی۔“

آئی۔ جی ہنسنے لگا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”واقعی ہم لوگوں کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں رہی۔

غالباً اس الماری میں کوئی چوہا ہے۔“

”چوہا! وہ دیکھئے! سنئے یہ آواز کچھ ایسی ہی ہے جیسی مائیکروفون میں ہاتھ لگنے یا کسی دوسری چیز کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔“

آئی۔ جی غور سے سنئے لگا پھر سر ہلا کر ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ ”ہے تو۔“

ڈی۔ آئی۔ جی نے الماری کھول کر دیکھا۔ وہاں کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا لیکن آواز تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد برابر سنائی دیتی رہی۔ دفعتاً اُس نے الماری کے پیچھے جھانک کر دیکھا اور اس کے منہ سے ایک خیر آمیز سی آواز نکل گئی۔

”ڈکٹافون!...!“ وہ آئی۔ جی کی طرف مڑ کر بولا۔ ”یہاں ڈکٹافون کا کیا کام۔“ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ آئی۔ جی نے آپریشن روم کے انچارج کو پھر بلوایا۔ لیکن اس نے بتایا کہ محکمے کے سارے ڈکٹافون آپریشن روم ہی میں موجود ہیں اور اس کمرے میں تو کبھی کوئی ڈکٹافون لایا ہی نہیں گیا۔

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ کوئی ہماری گفتگو سنتا رہا ہے۔“ آئی۔ جی نے کہا۔ اس انکشاف پر محکمے کی عمارت کو ایک دوسرے زلزلے سے دوچار ہونا پڑا۔ سارے کمرے چھان مارے گئے اور نتیجے کے طور پر پانچ عدد دست اور بھی برآمد ہوئے۔

لیکن ان کا سلسلہ کہاں سے تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک انسپکٹر نے اس کا بھی پتہ لگا لیا۔ ٹیلی فون کے تاروں پر لپٹے ہوئے باریک باریک تار دکھائی دیئے جن کا سلسلہ دوسرے کھمبے تک جا کر ختم ہو گیا تھا اور وہیں سے تار نیچے کی طرف لائے گئے تھے۔ دوسرا کھمبہ دراصل مہندی کی ایک پتہ ترتیب بازھ کے درمیان میں تھا اور اس کی بے مرمت شاخیں کافی اونچائی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس لئے ان تاروں کا آسانی سے دیکھ لیا جانا تقریباً ناممکن ہی تھا۔

پھر مہندی کی بازھ سے ملی ہوئی مالتی کی جھازیوں میں ڈکٹافون کاریسونگ سیٹ بھی مل گیا۔ اس کی تلاش کے سلسلے میں کافی ہنگامہ برپا ہو گیا تھا اور ڈی۔ آئی۔ جی سوچ رہا تھا کہ ان سے ایک ہمالیائی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔

”ہم سے غلطی ہوئی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ ”اب اس آدمی کا پتہ چلنا دشوار ہے جو انہیں استعمال کرتا ہے۔“

ایک آلہ سماعت جو دوسروں کی لاعلمی میں ان کی پوشیدہ گفتگو سننے کے لئے استعمال کیا ہے۔

”غلطی تو سچ ہوئی۔“ آئی۔ جی مضحل آواز میں بولا۔

”اگر فریدی ہوتا۔۔۔!“

آئی۔ جی کے حلق سے نکلنے والی غصیلی آواز نے ڈی۔ آئی۔ جی کو جملہ مکمل نہ کرنے دیا۔

”کیا ہوتا۔“ آئی۔ جی جھنجھلا کر کہہ رہا تھا۔ ”تم لوگوں نے اسے فوق البشر کا درجہ دے رکھا

ہے اور اسی لئے اس کا دماغ عرش پر رہتا ہے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اب کچھ بولے گا ہی نہیں۔

کچھ دیر بعد وہ پھر اسی کمرے میں آ بیٹھے جہاں ڈکٹافون کا پہلا سیٹ ملا تھا۔ وہ دونوں خاموش

ہی تھے اور ان کے چہروں پر ناگواری کے اثرات پائے جا رہے تھے۔

آپریشن روم کے انچارج کے قدموں کی آہٹ نے خاموشی کا طلسم توڑ دیا۔ وہ آئی۔ جی کے

سامنے ایک کاغذ رکھ کر واپس چلا گیا۔

یہ سیکرٹ سروس کے ہیڈ کوارٹر والوں کی رپورٹ تھی جو ٹرانسمیٹر پر موصول ہوئی تھی۔

آئی۔ جی پڑھنے لگا۔

”پانچویں آدمی کام کر رہے ہیں۔ تین دن قبل ان کی تنخواہیں ادا کی گئی ہیں۔ ان کی جائے

رہائش کے متعلق کسی کو کوئی علم نہیں۔ جب ضرورت محسوس ہوگی ان سے معلوم کر لی جائے

گی۔ لیکن اس کے لئے بھی اوپر سے آئے ہوئے احکامات ہی کار آمد ثابت ہو سکیں گے۔“

آئی۔ جی تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر سر ہلا کر بولا۔

”عجیب بات ہے۔“

”ہے تو عجیب ہی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ اب وہ اس

موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا لیکن وہ حقیقتاً فریدی کے اس خیال سے متفق تھا کہ سیکرٹ سروس والے

بھی مار ڈالے گئے اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر نارنگ کے دیہی بچکے کی خفیہ نگرانی شروع کر اوسے۔

سعی لا حاصل

ایک دن رشیدہ بہت سویرے آفس پہنچ گئی۔ لیکن یہ محض اتفاق نہیں تھا بلکہ اُس نے دیدہ

دانستہ ایسا کیا تھا۔ تین چار دنوں کے دوران اس نے جیمس اینڈ جعفری فرم کے متعلق بہت کچھ معلوم کر لیا تھا اور جعفری کے سلسلے میں یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ وہ اکثر اپنے کمرے میں بیٹھے ہی بیٹھے حیرت انگیز طور پر غائب ہو جایا کرتا تھا۔ جعفری کے کمرے کا دروازہ اسی بڑے کمرے میں کھلتا تھا جس میں رشیدہ اور راحیلہ بیٹھا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ دوسری طرف صرف کھڑکیاں تھیں اور ان میں بھی لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ورنہ یہ خیال ہوتا کہ وہ باہر جانے کے لئے ان کھڑکیوں ہی کو استعمال کرتا ہو گا۔ لہذا رشیدہ کا خیال تھا کہ اس کے کمرے میں چور دروازہ ہے اور وہ اسے ڈھونڈھ نکالنا چاہتی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ جعفری دس بجے سے پہلے آفس میں نہیں آئے گا ورنہ شاید وہ اس کی بہت بھی نہ کرتی۔ کیونکہ محض اس کی آنکھوں ہی سے اُس کی روح فنا ہونے لگتی تھی۔ آٹھ بج رہے تھے ساڑھے نو بجے سے قبل راحیلہ کے آنے کے بھی امکانات نہیں تھے۔

صفائی کرنے والا کمرے کی صفائی کر کے جا چکا تھا اور چپ اسی بڑے کمرے کے باہر اسٹول پر بیٹھا بڑے مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ رشیدہ کو خلاف معمول اتنے سویرے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی لیکن رشیدہ نے پچھلے دن کے بقیہ کام کو بنانے کا بہانہ کر کے اس کی حیرت زیادہ نہ بڑھنے دی۔ حالانکہ یہ چیز جیمس اینڈ جعفری کی فرم کے قاعدے کے خلاف تھی۔ لیکن چپ اسی شاید یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ مس صاحبہ ابھی نئی پھنسی ہیں۔ جس دن منیجر صاحب نے کان کھول دیئے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

رشیدہ فائیل نکال کر ٹائپ کرنے بیٹھ گئی لیکن چپ اسی کا مسئلہ؟ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کس طرح نکالا جائے۔ دفعتاً اُس نے آواز دی۔

”دیکھو.....!“ اُس نے کہا۔ ”مجھے دو درجن لفافوں اور اتنے ہی پوسٹ کارڈوں کی ضرورت ہے اگر لا دو تو بڑا کام کرو۔ ابھی کافی وقت ہے۔“

”لا دوں گا! مس صاحب۔“ وہ دانت نکال کر بولا۔ ”یہ بھی کوئی کام میں کام ہے۔“

رشیدہ پانچ کانوٹ نکال کر اُسے دیتی ہوئی بولی۔ ”بقیہ تمہارے ناشتے کے لئے۔“

”ارے..... ہی..... ہی..... ہی“ چپ اسی نے ایک بار پھر دانت نکال دیئے۔

رشیدہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ڈاکخانہ اتنی دور تھا کہ آدھ گھنٹے سے قبل اس کی واپسی ناممکن

تھی۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جعفری کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ یہاں کچھ زیادہ فرنیچر نہیں تھا۔ سامنے ایک بڑی سی میز تھی اور اُس کے پیچھے ایک چکر کھانے والی کرسی اور ایک تجوری، دونوں بازوؤں میں دو بڑی بڑی الماریاں تھیں جن کی چوڑائی نے دونوں طرف کی دیواروں کو تقریباً ڈھک لیا تھا۔ رشیدہ نے سب سے پہلے دونوں الماریوں کے پیچھے جھانک کر دیکھا۔ دیواریں سپاٹ تھیں۔ پھر وہ میز کی طرف بڑھی۔ کرسی کے پیچھے لکڑی کا ایک بڑا صندوق نظر آیا جو مقفل نہیں تھا۔ رشیدہ نے یونہی بے خیالی میں اُس کا ڈھکن اٹھا دیا.... اور پھر دوسرے لمبے میں اُس کی سانس بُری طرح پھول رہی تھی۔ پورا صندوق ریوالتور سے بھرا ہوا تھا اور یہ سب بالکل نئے تھے۔

رشیدہ نے جیمس اینڈ جعفری کی تجارت کے متعلق اچھی طرح چھان بین کی تھی اور اُسے یقین تھا کہ اسلحہ جات کی تجارت اُس فرم میں نہیں ہوتی تھی۔ اس نئی دریافت سے پیدا ہوا جانے والے جوش نے فی الحال چور دروازے کا خیال تو اس کے ذہن سے نکال ہی دیا۔ صندوق کا ڈھکن بند کر کے وہ الٹے پاؤں اپنے کمرے میں واپس آگئی۔

وہ کچھ دیر تک اپنی میز پر بیٹھی ہانپتی اور چہرے سے پسینہ پونچھتی رہی پھر یکبارگی اٹھی اور باہر نکل آئی۔ اُسے محکمہ سراغ رسانی کے ان آدمیوں میں سے کسی کی تلاش تھی جنہیں فریدی نے جیمس اینڈ جعفری کے دفتر کے قرب و جوار میں رہنے کی تاکید کی کر دی تھی۔

سامنے والے ریسٹوران میں اُسے ایک جانے پہچانے چہرے کی جھلک دکھائی دی۔ یہ سرجنٹ حمید تھا اور اب تک اسی شکاری ہی والے بھیں میں تھا۔ رشیدہ نے تیزی سے سڑک پار کی اور ریسٹوران میں داخل ہو گئی۔

”ہلو....!“ حمید نے مسکراتے آواز سے آنکھ ماری۔

”میں نے ایک نئی دریافت کی ہے۔“ رشیدہ ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ ”اس کیمین میں اٹھ چلو۔“ وہ دونوں کیمین میں آکر بیٹھ گئے اور رشیدہ نے پردہ کھینچ دیا۔ پھر اُس نے جلدی جلدی اپنا کارنامہ دہرایا۔

”تمہیں یقین ہے کہ اسلحہ کی تجارت ہوتی ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”سو فیصدی یقین ہے۔“

”اچھا تو تم یہیں بیٹھو۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ”ابھی آفس میں واپس نہ جانا۔ اس چیر اسی کو دیکھتی رہو اور اس سے جو کچھ بھی منگوایا ہے باہر ہی لے لو تو بہتر ہے پھر تم نہایت آسانی سے اسے یہ سمجھا سکتی ہو کہ تم ابھی آفس واپس نہ جاؤ گی۔ کیونکہ تمہیں ایک دوسرا ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ سمجھ گئیں۔“

”اچھا پھر....!“

”اپنے وقت سے آفس جاؤ گی۔“

”ٹھیک! لیکن اگر چیر اسی نے اس کا تذکرہ کسی سے کر دیا تو۔“

”دیکھا جائے گا.... تم نے ضرور نانا تو ملازمت کی نہیں ہے۔“

حمید ریسٹوران سے چلا گیا اور رشیدہ باہر آ بیٹھی۔ اس نے بیرے کو بلا کر ناشتے کا آرڈر دیا اور فٹ پاتھ پر نظریں جمادیں۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں چیر اسی نکل نہ جائے۔

چیر اسی خلاف توقع جلد ہی نظر آ گیا۔ لیکن ساتھ ہی رشیدہ کو ایک دوسرا خیال بھی آ گیا۔ وہ جلدی میں اپنا فائل میز پر ہی چھوڑ آئی تھی اور اس کی عدم موجودگی میں اس کا وہاں پایا جانا قطعی نامناسب تھا لہذا اس نے چیر اسی کو باہر ہی روکنے کا خیال ترک کر دیا۔ ابھی ساڑھے آٹھ ہی بجے تھے۔

اس نے جلدی جلدی الناسیدھانناشتہ کیا اور باہر نکل آئی۔ آفس پہنچی تو چیر اسی لہک کر اٹھا۔

”میں ذرا ناشتہ کرنے چلی گئی تھی۔“ رشیدہ نے اس بے لفافے اور پوسٹ کارڈ لیتے ہوئے

کہا۔ چیر اسی نے بقیہ پیسے بھی واپس کرنے چاہے لیکن رشیدہ نے لینے سے انکار کر دیا۔ چیر اسی

سلام کر کے بڑبڑانے لگا۔ ”خدا آپ کا بھلا کرے۔ بچے کے لئے چل ہو جائے گی۔ مس صاحب

میرے آٹھ بچے ہیں۔ بہت غریب آدمی ہوں۔ یہاں کل ساٹھ روپے ملتے ہیں نہ انعام نہ

بخشش۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔“

”چچ چچ....!“ رشیدہ غمناک انداز میں سر ہلا کر بولی۔ ”میں کسی دن تمہارے بچوں سے ملنے

کے لئے آؤں گی۔“

”ارے.... آپ مس صاحب.... ہم غریب آدمی ہیں۔“

”غریب سے کیا ہوتا ہے ہمارے بھائی ہو۔“

”خدا آپ کا بھلا کرے۔“ چیر اسی پیشانی کی طرف ہاتھ لے جاتا ہوا بولا۔ ”مگر.... مس

صاحب ایک بات کہوں.... آپ نئی ہیں۔“
 ”کیا.... کہو کہو۔“

”صاحب بڑا بُرا آدمی ہے۔ کسی کی عزت کو عزت نہیں سمجھتا اس کا حکم ہے کہ نہ وقت سے پہلے آؤ اور نہ وقت کے بعد رکو۔ ولایت ہو آیا ہے نا۔ پانچ برس وہاں رہا ہے۔ کہتا ہے سب کام قاعدے سے ہونا چاہئے۔ اگر اسے کبھی معلوم ہو گیا کہ آپ وقت سے پہلے آئی تھیں.... تو۔“
 ”اوہ....!“ رشیدہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”تو میں چلی جاؤں۔“

”ہاں مس صاحب وہ بہت بُرا آدمی ہے۔“
 ”تو تم کسی سے کہو گے نہیں۔“
 ”ارے نہیں صاحب۔“

رشیدہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک بہت بڑا مسئلہ خود بخود حل ہو گیا تھا اس نے جلدی سے فائل کو الماری میں ڈالا اور اپنا ہیڈ بیگ سنبھالتی ہوئی باہر نکل آئی۔

بقیہ وقت اُس نے دوسری سڑک کے ایک ریستوران میں گزارا اور ٹھیک سوانو بجے وہاں سے آفس چل پڑی۔ آفس پہنچتے ساڑھے نو بج گئے۔ بڑے کمرے میں دو پولیس انسپکٹر چند کانسٹیبلوں کے ساتھ موجود تھے اور راحیلہ کھڑی انہیں گھور رہی تھی۔ شاید وہ بھی ابھی آئی تھی۔ اس نے رشیدہ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور اپنی میز پر بیٹھ گئی۔ رشیدہ نے بھی چہرے پر حیرت کے آثار پیدا کئے اور راحیلہ سے سر کے اشارے سے ان کی موجودگی کا مطلب پوچھا راحیلہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

رشیدہ نے اپنا فائل نکالا اور نائپ رائٹر سنبھال بیٹھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر ایک سب انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ ”کس کا انتظار ہے آپ کو۔“
 ”جعفری صاحب کا۔“ اس نے جواب دیا۔

اتنے میں راحیلہ شاید کسی کاغذ کے لئے جعفری کے کمرے میں جانے لگی لیکن سب انسپکٹر نے اُسے روک دیا۔

”کیوں؟“ راحیلہ گھبرا کر بولی۔
 ”یونہی! تشریف رکھئے۔“

راحیلہ بیٹھ گئی۔ اُس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آرہے تھے۔

”آخر بات کیا ہے؟“ رشیدہ نے حیرت سے پوچھا۔

”کوئی بات نہیں۔“ سب انسپکٹر نے کہا اور سگریٹ ساگانے لگا۔

ٹھیک دس بجے جعفری دفتر میں داخل ہوا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا پھرا نہیں گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

”آہم....!“ غراہٹ سنائی دی۔ ”کیا بات ہے۔“

”اس کمرے کی تلاشی لینی ہے۔“ سب انسپکٹر بولا۔

”کیوں؟“

”اوپر سے حکم ملا ہے اور یہ رہا تلاشی کا وارنٹ۔“

”آہم....!“ جعفری کی غراہٹ بڑھ گئی۔ ”اس حماقت کا مقصد۔“

”ہم یہاں فضول باتیں سننے کے لئے نہیں آئے۔“ ایک سب انسپکٹر بگڑ کر بولا پھر اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ دروازہ جعفری کے کمرے میں گھستے چلے گئے۔ رشیدہ کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

”شاید ان لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ جعفری نے رشیدہ اور راحیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں جیمس بارٹلے کا فائل لینے اندر جا رہی تھی۔“ راحیلہ نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

”لیکن انہوں نے مجھے اندر نہیں جانے دیا۔“

”ان کی شامت آئی ہے۔“ جعفری بلند آواز میں بولا اور رشیدہ متحیر رہ گئی۔ کیونکہ اس نے

یہ جملہ دراصل پولیس والوں کو سنانے ہی کے لئے کہا تھا۔

جعفری اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اسکے بعد راحیلہ بھی اٹھی اور رشیدہ نے اس کی تقلید کی۔

سب انسپکٹر بکس کا دھکن اٹھائے اپنے ساتھیوں کو گھور رہا تھا اور بکس بالکل خالی تھا۔ رشیدہ

کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اچھا ہی ہوا کہ جعفری پولیس والوں کی طرف متوجہ تھا ورنہ

رشیدہ کے چہرے کی بدلتی ہوئی حالتوں سے کم از کم کھٹک ضرور جاتا۔

”آخر مطلب کیا ہے؟“ جعفری گرج کر بولا۔

”ار.... بات یہ ہے۔“ سب انسپکٹر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ہمیں اطلاع ملی ہے کہ

یہاں.... اس کمرے میں کوئی چور دروازہ ہے۔“

جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی دوسرے سب انسپکٹر نے کمرے کی دیواروں کو کھٹکھٹانا شروع کر دیا تھا۔

”گٹ آؤٹ۔“ جعفری حلق کے بل چیخا۔ اُس کی خوف ناک آنکھیں اُبل پڑی تھیں اور چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ ہیبت ناک معلوم ہونے لگا تھا۔
”لینکونج پلیر....“

”آئی سے گٹ آؤٹ۔“ جعفری ایک قدم آگے بڑھتا ہوا بولا۔

”مجھے مجبور نہ کیجئے کہ میں آپ کو حراست میں لے لوں۔ آپ اس طرح براہ راست حکومتی اہلکاروں کی توہین کر رہے ہیں۔“

دفعتاً جعفری اپنا رویہ بدل کر آہستہ سے بولا۔ ”مجھے افسوس ہے! لیکن آپ کو بھی یہ نہ چاہئے کہ معزز اور بے ضرر شہریوں کی توہین کرتے پھریں۔ فرض کرو کہ اگر یہاں کوئی چور دروازہ ہے بھی تو حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔“

”کچھ دیر قبل....“ سب انسپکٹر چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”یہاں سے کچھ غیر قانونی اشیاء اسی چور دروازے سے باہر لے جائی گئی ہیں۔“

”یقیناً.... حکومت نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔“ جعفری نے تلخ لہجے میں کہا اور پھر اس سب انسپکٹر سے بولا، جو دیواریں کھٹکھٹاتا پھر رہا ہے۔ ”کیوں؟ پلاسٹر اور وقت برباد کر رہے ہو۔ یہ رہا چور دروازہ۔“

اُس نے بڑی میز کو دھکا دیا اور وہ ایک تیز قسم کی آواز کے ساتھ چکنے فرش پر پھسلتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ پھر اس نے مینٹل پیس پر رکھے ہوئے ایک آدھے جسے کا سر گھمایا۔ کھٹاکے کی آواز کے ساتھ فرش کا درمیانی حصہ کھسک گیا اور ایک تاریک سی خلاء ظاہر ہو گئی۔
”یہ ہے وہ چور دروازہ۔“ جعفری غرایا۔

پولیس والے کبھی حیرت سے اسے دیکھتے تھے اور کبھی تہہ خانے کے تاریک دہانے کو۔
”جاؤ دیکھو.... کیا ہے اس میں۔“ جعفری پھر غرایا۔ ”شاید وہ غیر قانونی اشیاء اسی کی منتظر رہی ہوں.... جاؤ نا.... وہاں بھیڑیے نہیں ہیں۔“

ایک سب انسپکٹر تہہ خانے کی طرف بڑھا لیکن پھر رک کر جعفری کی طرف دیکھنے لگا جو کرسی پر بیٹھ کر اپنا پاپ ساگانے لگا تھا۔ اس نے اپنی بھنوں میں تان کر سب انسپکٹر کی طرف دیکھا اور پاپ کو دانتوں میں دبائے ہی دبائے کہنے لگا۔ ”جاؤ نا.... لیکن میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ میرے پاس برباد کرنے کے لئے وقت نہیں۔“

وہ سب انسپکٹر تین کانسیلوں کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ دوسرا اوپر ہی رہا۔
”لڑکیو! بیٹھ جاؤ۔“ جعفری رشیدہ اور راحیلہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”ابھی یہ لوگ نٹ کا تماشہ دکھائیں گے۔“

”میں کہتا ہوں۔“ سب انسپکٹر نے جھلا کر کہا۔ ”آپ اتنے بد تہذیب کیوں ہیں۔“
”آہم.... آدمی کو پہچان کر برتاؤ کرنے کا عادی ہوں۔ میں تمہارے جھگے پر ہر جانے اور ازالہ حیثیت عربی کا دعویٰ کروں گا.... مذاق ہے۔“
تھوڑی دیر بعد انسپکٹر واپس آگیا اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”شراب کی پیٹیاں ہیں.... اور غالباً....!“
”جناب....!“ جعفری نے اُس کی بات کاٹ کر مضحکہ انداز میں کہا۔ ”اور فرم کے پاس ولایتی شراب درآمد کرنے کا لائسنس بھی ہے۔“
”پیٹیاں کھلی ہیں یا بند۔“ انسپکٹر نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔
”بند ہیں۔“

”تو وہ کھولی جائیں گی۔“
”کھولو....!“ جعفری لاپرواہی سے بولا۔
تقریباً دو گھنٹے تک کام جاری رہا لیکن پیٹیوں میں شراب کی بوتلوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ نکلا۔ تہہ خانے میں کسی دوسرے دروازے کی بھی تلاش کی جا رہی تھی لیکن بے سود.... پولیس والے ہانپتے ہوئے تہہ خانے سے نکل آئے۔

”میں پورے آفس کی تلاشی لوں گا۔“ ایک بولا۔
”ضرور لو....!“ جعفری غرایا۔ ”کم از کم دو لاکھ ہر جانے کا دعویٰ کروں گا۔“
رشیدہ کی حالت ابتر تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ فریدی کو کیا جواب دے گی۔ آفس کے

دوسرے کمروں کی بھی تلاشی لی گئی لیکن نتیجہ وہی صفر۔ ریوالور تو کیاربولور کی تصویر بھی نہ مل سکی۔ تلاشی ختم ہونے کے بعد جعفری نے چنگھاڑ چنگھاڑ کر سارا دفتر سر پر اٹھالیا۔ پولیس والوں کے چلے پر بھی وہ کافی دیر تک بیٹھا کسی غصیلہ بلڈاگ کی طرح غراتا رہا۔ آفس ٹائم کے بعد رشیدہ باہر نکلی تو بڑی طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ بس سٹینڈ پر حمید سے ملاقات ہو گئی۔ شاید وہ وہاں اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

”کیوں؟ کیا یہ اسی رات کا بدلہ تھا۔“ حمید نے منہ بنا کر کہا۔
 ”خدا کی قسم مجھے خود حیرت ہے۔“ رشیدہ جلدی سے بولی۔ ”میں یہی سوچ رہی تھی کہ تم یہی سمجھو گے۔“

”بہر حال مجھے کافی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”اس وجہ سے اور پریشانی ہے کہ میں نے فریدی صاحب سے مشورہ لئے بغیر تلاشی کا وارنٹ نکالوا لیا تھا۔“
 ”پھر اب بتاؤ میں کیا کروں۔“ رشیدہ بے بسی سے بولی۔

”اس لڑکی سے میرا تعارف کرادو جو تمہارے کمرے میں بیٹھی ہے۔“ حمید مسکرا کر بولا۔
 ”مت فضول بکو۔“ رشیدہ نے ایک بے جان سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”وہ بہت شریف لڑکی ہے۔“

”لڑکی تو ہے.... اگر وہ کمینی بھی ہوتی تو میں اسے برداشت کر لیتا۔“
 ”کسی وقت تو سنجیدہ ہو جایا کرو۔“

”کبھی نہیں۔ آج صبح تمہاری ہی بدولت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ نتیجے میں یہ ذلت نصیب ہوئی خیر اچھا پھر سہی! نا نا۔“

وہ فٹ پاتھ پر ریٹنگنے والی بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

دومکار

آر لکچو میں بڑا شاندار پروگرام تھا۔ سردیوں کی خوشگوار رات تھی اور اس لئے اور بھی خوشگوار تھی کہ دوسرے دن اتوار تھا۔

سر جنٹ حمید اور ناگر بیٹھے بڑی دیر سے رقص میں شرکت کرنے والوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہاں وہ کسی خاص مقصد کے تحت نہیں آئے تھے۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ اور تھکن نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ ناگر تو جس وقت سے آیا تھا برابر بیڑ پیٹے جا رہا تھا۔ حمید اس وقت شکاری کے لباس میں نہیں تھا۔ البتہ میک اپ وہی پرانا تھا۔ اس نے عمدہ قسم کا ڈنر سوٹ پہن رکھا تھا اور کانوں میں ہیرے ڈال لئے تھے۔ بہر حال وہ اس وقت راجپوتوں کی کسی شاہی نسل کا ایک متمول فرد معلوم ہو رہا تھا۔ چڑھی ہوئی گھنی سیاہ مونچھیں ظاہری وجاہت میں خاص اضافہ تھیں۔

”اے اوڈانگر۔“ حمید ناگر کی بوتل پر کاگ رکھتا ہوا بولا۔ ”اب بس کرو۔“

”باس! ابھی سے باس۔“ ناگر انگلی نچا کر بولا۔

”ارے تمہیں بیڑ سے بھی نشہ ہو جاتا ہے۔“

”چوتھی بوتل ہے.... ہی ہی میں کیا نشہ۔“

”اے چل بھی سکو گے اب تم! مینڈک کہیں کے۔“

”مینڈک ہی ہی ہی.... مینڈک.... مینڈک کا چار کھایا ہے تم نے کبھی۔“

”مت بور کرو۔“ حمید بھنا کر بولا۔

”آج میں بہت اداس ہوں۔“ ناگر رک رک کر بولا۔

”نہیں دیو داس ہو.... مت دماغ چاٹو۔“

”دیو داس بھی پیتے پیتے مر گیا تھا.... اور میں بھی کسی دن پیتے پیتے مری جاؤں گا.... مم....“

ار.... کنور صاحب.... میں حمید صاحب کہنے جا رہا تھا.... کیا نام بتایا تھا آپ نے۔“

”کنور رنجیت سنگھ۔ اگر تم ذرا بھی بہکے تو الٹا ہاتھ رسید کروں گا۔“

”میں تم سے کمزور نہیں ہوں.... ہاں۔“ ناگر بھنوائیں چڑھا کر بولا۔

”نہیں نہیں تم رستم ہو۔“ حمید نے جلدی سے کہا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں ناگر نشے میں ہاتھ

سے نہ نکل جائے۔ دفعتاً اس کی نظریں جعفری پر جم گئیں جو کاؤنٹر پر بار مین سے باتیں کر رہا تھا۔

”ناگر ڈیر۔“ حمید بولا۔ ”کیا تم اسے جانتے ہو۔“

ناگر نے مڑ کر دیکھا۔ اس وقت جعفری مجمعے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یک بیک حمید نے محسوس

کیا جیسے ناگر کا نشہ ہی ہرن ہو گیا ہو۔ وہ پلٹ کر خوفزدہ نظروں سے حمید کی طرف دیکھنے لگا۔ ساتھ

ہی وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان بھی پھیرتا جا رہا تھا۔

”کیوں....!“ حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”اس کی آنکھیں....!“ ناگر آہستہ سے بڑبڑایا۔

”تمہیں پسند نہیں آئیں۔“ حمید نے ہنس کر کہا۔

”میں جا رہا ہوں۔“ ناگر اٹھنے لگا۔

”بیٹھو....!“ حمید اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”آنکھیں.... مجھے نہ روکنے۔“

”بیٹھو....!“ حمید نے زبردستی اسے بٹھا دیا۔ ناگر بڑی طرح کانپ رہا تھا۔

”بیز اور منگاؤں۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں....!“ ناگر نے آہستہ سے کہا۔ وہ اب بھی مڑ مڑ کر جعفری کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔

”آخر بات کیا ہے۔“

”وہ آنکھیں۔“

”ارے تو بولونا بابا! یہ شعر ہے یا مصرع۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ وہی آنکھیں ہیں جنہوں نے مجھے دریا میں چھلانگ لگانے پر مجبور کیا تھا۔“

”اوہ.... تمہیں یقین ہے۔“

”بالکل ویسی ہی ہیں۔“

”تو خیر بھاگنے کی ضرورت نہیں۔“

”میری جان نہ لیجئے۔“

”چپ بے.... ڈیوٹ۔“

ناگر ایک طرف گردن ڈال کر بیٹھ گیا۔

”وہ تمہیں اس میک اپ میں پہچان نہ سکے گا۔“ حمید نے اسے تسلی دی۔

”کون؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ.... ارے۔“

”چپ رہو پھسندی۔“

”خیر جان تو جانی ہی ہے کیوں نہ میں ہی....!“ ناگر کا کانپتا ہوا ہاتھ اُس کی جیب کی طرف

جارہا تھا۔

”خبردار.... پاگل ہوئے ہو۔“ حمید نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”مجھے یقین ہے کہ یہی مسٹر کیو ہے۔“ ناگر کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

”بکو نہیں.... محض آنکھوں کی بناء پر.... اور پھر تم یقین کے ساتھ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہ آنکھیں تمہارے مسٹر کیو ہی کی ہیں۔“

”پھر یہ ہے کون....!“ ناگر نے پوچھا۔

”جیمس اینڈ جعفری کی فرم کا جنرل منیجر مسٹر جعفری۔“

”اوہ تب تو۔“ ناگر کی آواز میں پھر کپکپاہٹ تھی۔ ”تب تو.... پھر آخر فریدی صاحب نے

اس کے پیچھے آدمی کیوں لگائے ہیں۔“

”پتہ نہیں! چلو چھوڑو۔ ہمیں اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ جیسا کہا جائے گا کریں

گے۔ ہائے کیا کیا یلیاں نظر آرہی ہیں۔“

”یلیاں کیا؟“ ناگر نے پوچھا۔ لیکن وہ اب بھی خوفزدہ نظروں سے جعفری ہی کی طرف

دیکھے جارہا تھا۔

”اب تم یلیاں نہیں سمجھے۔“

”نہیں۔“

”یلیاں خوبصورت لڑکی کو کہتے ہیں لفظ ”لڑکی“ میں ”ز“ مجھے بہت گراں گزرتا ہے اور پھر

خوب صورت لڑکی اُسے تو پکلیلا ہی سانا م دینا چاہئے۔ یلیاں بہت مناسب ہے۔“

”زبردستی خواہ مخواہ۔“ ناگر نے منہ بنایا۔ وہ دراصل کسی طرح جعفری کے خیال سے پیچھا

چھڑانا چاہتا تھا۔ جواب ہال میں نہیں تھا۔

”زبردستی کیوں؟ ذرا اس یلیاں کی آنکھیں تو دیکھو۔“ دفعتاً حمید چونک کر بولا۔

حمید ایک لڑکی کو بڑی توجہ اور دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔

”واقعی لا جواب آنکھیں ہیں۔“ ناگر بڑبڑایا۔

”لیکن تم کو کسی اور کی آنکھیں بھی یاد آرہی ہوں گی۔“

”کس کی؟“

”خدا کی قسم یہ کنول کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“ حمید سیدھا ہو کر بولا۔

”کنول....!“ ناگر ہنسنے لگا۔ ”شاید آپ اس کی شکل بھول رہے ہیں۔“

”اور شاید وہ بھی تمہاری موجودہ شکل بھول جائے۔“

”تو کیا میک اپ ہے۔“ ناگر نے پوچھا۔

”قطعاً! یہ آنکھیں اور یہ گردن جھٹکنے کا مخصوص انداز کنول ہی کا ہو سکتا ہے۔“ حمید اپنی جگہ

سے اٹھتا ہوا بولا۔

آرکسٹر شروع ہو گیا تھا۔ اوگ رقص کے لئے اپنی جگہیں چھوڑ رہے تھے حمید جھپٹ کر اس

لڑکی کے قریب پہنچا۔

”کیا میں آپ سے رقص کی درخواست کر سکتا ہوں۔“ اس نے بڑے سلیقے سے جھک کر کہا۔

”جج.... جی ہاں.... مجھے خوشی ہوگی۔“

اس دوران میں آرکسٹر انے دھن بدلی اور والز بجنے لگا۔ وہ دونوں رقصوں کی بھیڑ میں

آگئے۔ لڑکی نے اپنا جسم تان کر ٹھوڑی آگے کی طرف نکالی اور کولہوں کو پیچھے ہٹا کر حمید کے

کاندھوں پر زور ڈال دیا اور حمید نے اسے گول گول چکر دینے شروع کر دیئے۔

”آپ کو والز کا بڑا سلیقہ ہے۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

”شکریہ۔“

”آپ کے بال بڑے حسین ہیں۔“

”اور آپ کی مونچھیں۔“ لڑکی مسکرائی۔ ”حالانکہ نقلی ہونے کی وجہ سے ایسی معلوم ہوتی

ہیں جیسے کسی امرود پر گھاس اگ آئی ہو۔“

”اوہو....!“ حمید نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”لیکن آپ کی آنکھوں کے کنول ہمیشہ شاداب

رہیں گے۔“

لڑکی ایک طویل سانس لے کر بولی۔ ”تو تم نے پہچان لیا.... امرود بخت۔“

”دور ہی سے پہچان گیا تھا۔“

”تو پھر گرفتار کرادو نا۔“

”ہے ہے! تمہیں میں گرفتار کراؤں گا.... تمہیں یلایلی کو....!“

”یہ کیا بلا ہے۔“

”میری لغت میں انتہائی حسین لڑکی کو کہتے ہیں۔“

”تم مکار ہو.... ہر جائی کہیں کے! میں تمہیں کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔“

”پھر بھی تمہارے مالک نے مجھے گولی کا نشانہ نہیں بنایا۔“ حمید کے لہجے میں حیرت تھی۔

”بھلا تم جیسے الا بلا کو۔“

”میں الا بلا ہوں۔“ حمید نے بُرا مان کر کہا۔

”بگڑو نہیں میری لغت میں الا بلا انتہائی شری لڑکے کو کہتے ہیں۔“

”کنول ڈارلنگ مجھے حیرت ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو۔ بے چارے ناگر کا تو بہت بُرا حشر ہوا۔“

”اُس مسخرے کا حشر۔“ کنول ہنس کر بولی۔ ”واقعی بہت بُرا ہوا ہے۔ بیڑی کی چار چار بوتلیں

ایک ہی نشست میں صاف کر دیتا ہے۔“

”ارے تم اُسے بھی پہچان گئی ہو۔“

”کیوں نہیں! مجھے عرصہ سے تم لوگوں کی تلاش تھی۔“

”کیوں....!“

”مالک کا حکم! اور جس دن میں نے اطلاع دے دی تم لوگ ٹھکانے لگا دیئے جاؤ گے۔“

”ابھی تک کیوں نہیں دی۔“

”میری مرضی۔“

”کل کہاں ملو گی۔“

”کہیں نہیں.... لیکن تمہارے گرو گھنٹال کا پتہ آج تک نہ چل سکا۔“

”اور تو یہ کہو! اس طرح پتہ لگانا چاہتی ہو۔“

”یہ تم کہہ رہے ہو جسے میں نے تکلیف سے بچانے کے لئے خواب آور دوا دی تھی۔“

”اس ہمدردی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔“ حمید ہنس کر بولا۔

”مجرم بھی آدمی ہی ہوتے ہیں اور ہر ایک کے لئے ان کے سینے میں پتھر کا ٹکڑا نہیں ہوتا۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر حمید بولا۔ ”تو.... تم آج تک اپنے مالک کی شخصیت کے

متعلق کچھ نہیں معلوم کر سکیں۔“

”نہیں.... اب میں اسے پھانسی کے تختے ہی پر پہنچانا پسند کروں گی۔“

”یہ تبدیلی کیوں؟“

”محض اسلئے کہ وہ آدمی نہیں جانور ہے۔ اُسے بتتے ہوئے خون سے پیار ہے وہ بھیڑیا ہے۔“

”جعفری کو جانتی ہو۔“

”کون.... وہی خوفناک آدمی.... جو ابھی کاؤنٹر پر تھا۔“

”ہاں.... وہی۔“

”آج کل اُس کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔“ کنول بولی۔

”کیا خیال ہے کہیں وہی تو تمہارا مالک نہیں۔“

”پتہ نہیں.... ویلے میں نے اسے اپنی لسٹ پر رکھ لیا ہے۔“

”لسٹ پر۔“

”ہاں مجھے بھی تو تمہاری ہی طرح مجرموں کی تلاش رہتی ہے۔“

”کیوں....؟“

”جس کے متعلق ذرا بھی شبہ ہوا کہ یہ کسی قسم کا مجرم ہو سکتا ہے میں اس کے پیچھے لگ جاتی

ہوں اور پھر اس کے متعلق معلومات فراہم کر کے اپنے مالک کو اطلاع دیتی ہوں اور پھر وہ اسے

بلیک میل کر کے اپنے گروہ میں شامل ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔“

”تمہاری یہی ڈیوٹی ہے۔“

”ہاں....!“

”فی الحال میری سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ....!“

”کیا....؟“

”ہم سے مل کر کام کرونا۔“ حمید نے اپنی آنکھیں نشلی بنا کر آہستہ سے کہا۔

”یہ کسی طرح ممکن نہیں۔“

”او نہہ.... چکر پورا نہیں ہوا۔“ حمید نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بایاں پیر.... ٹھیک....“

”کنول ڈارلنگ تم سچ سچ بڑی پیاری ہو۔“

”تم سو رہو۔ مجھے بے وقوف مت بناؤ۔“ کنول نے اس کے شانے پر چٹکی لی۔

”تم ایک محبت بھرے دل کے متعلق بہت کچھ جانتی ہو۔“ کنول نے منہ بنا کر کہا۔ ”تم روز ہی کسی نہ کسی لڑکی کو بیوقوف بناتے ہو۔ ہر جانی ہو تم.... ہری چک۔“

”میں نے آج تک کسی لڑکی کو بے وقوف نہیں بنایا البتہ بننا ہی رہا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں اب تک کنوارا ہوں۔“ حمید کی آواز گلوگیر ہو گئی اور وہ بولتا رہا۔ ”بہتیری لڑکیوں نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا۔ لیکن بعد میں کیڑے نکال دیئے کسی نے کہا کہ تمہاری ایک ٹانگ چھوٹی ہے اور ایک بڑی.... اچھا تمہیں بتاؤ.... اتنی دیر سے ناچ رہا ہوں تم نے کچھ محسوس کیا؟“

”نہیں تو....!“

”اگر ایک ٹانگ چھوٹی ہوتی تو میں باقاعدہ پھدکتا ہوتا۔ ایک لڑکی نے یہ کہہ کر میرا دل توڑ دیا کہ کھٹائی دیکھ کر میری رال ٹپکنے لگتی ہے۔ ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میں بڑھاپے میں بالکل کھوسٹ معلوم ہونے لگوں گا۔“

”اور میں یہ کہتی ہوں کہ تم سے بڑا مکار آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا.... وہ کوڑوں کی مار مجھے اب تک یاد ہے اور اس پر تمہارا رویہ۔ کوئی اور ہوتا تو اُس کے منہ سے آواز بھی نہ نکلتی۔“

”خوب یاد دلایا۔“ حمید نے کہا۔ ”وہ لڑکی تاد رہ کہاں ہے۔“

”پتہ نہیں.... اب میرے ساتھ نہیں ہے۔“

”کنول ڈارلنگ.... میں مرتے دم تک تمہیں یاد رکھوں گا.... ہائے وہ پہلی ملاقات وہ چاندنی رات اب بھی اکثر ذہن کے تاریک گوشوں میں پھسل آتی ہے۔ کاش یہ کم بخت تمہارا مالک درمیان میں حائل نہ ہوتا۔ میں اُسے کسی دن تھری زیرو پر فون کر دوں گا۔“

”بہت اچھے۔“ کنول نے قہقہہ لگایا۔ ”اس طرح تم مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ اب اس سے رابطہ قائم کرنے کا کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔“

”چلو یہی سمجھ لو.... ویسے تم مجھے مکار تو سمجھتی ہی ہو۔“ حمید معصومیت سے بولا۔

”فی الحال پیغام رسانی کے لئے آدمی استعمال کئے جا رہے ہیں۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ اُن آدمیوں تک اُس کے پیغام کس طرح پہنچتے ہیں۔“

دفتر حمید کی نظر ناگر کی طرف اٹھ گئی جو میز پر سر اوندھائے بیٹھا تھا۔ اس نے رقص میں

بھی شرکت نہیں کی تھی اور پھر اسے جعفری دکھائی دیا جو ناگر کے قریب ہی کھڑا کسی عورت سے باتیں کر رہا تھا۔ عورت کی پشت حمید کی طرف تھی۔ اتنے میں آرکسٹر ابند ہو گیا تھا۔ رقص اپنی میزوں کی طرف لوٹنے لگے۔ جعفری سے گفتگو کرنے والی عورت مجھے کی طرف مڑی اور حمید نے اسے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ رشیدہ تھی۔

شریف بھڑیا

رشیدہ اس وقت کسی طرح جعفری سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ اگر اسے ذرہ برابر شبہ بھی ہوتا کہ جعفری اسے یہاں مل جائے گا تو وہ ادھر کا رخ ہی نہ کرتی۔ دن بھر کی کوفت دور کرنے یہاں چلی آئی تھی۔ ویسے اسے یہاں جعفری کو دیکھ کر حیرت ضرور ہوئی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ بہت ہی خشک اور غیر سوشل قسم کا آدمی ہے اور پھر اسے بھول کر بھی یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرے گا۔ بہر حال وہ اس کے اس رویہ پر کھٹک ضرور گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید جعفری کو اس کی تلاشی والی حرکت کا علم ہو گیا تھا اور اب وہ اس طرح اسے کسی جال میں پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔

رشیدہ نے سر جنٹ حمید اور ناگر کو بھی دیکھا تھا۔ دوسرا اوڈنڈ شروع ہوتے ہی حمید پھر اسی لڑکی کے ساتھ ناچنے لگا تھا جس کے ساتھ اس نے پہلے رقص کیا تھا۔ ناگر کو میز پر سر اوڈنڈ ہائے دیکھ کر اس نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ شاید زیادہ پی گیا ہے۔ کیونکہ شراب کی بوتل اب بھی اس کی میز پر رکھی ہوئی تھی۔

”آؤ.... لاؤنج میں چلیں۔“ جعفری نے دوسرا اوڈنڈ شروع ہوتے ہی رشیدہ سے کہا۔ لاؤنج بالکل خالی تھی۔ وہاں بیٹھنے والے سب کے سب رقص میں شرکت کرنے چلے گئے تھے۔ جعفری نے بیٹھتے ہوئے جھک کر آہستہ سے کہا۔ ”لڑکی تم نے مجھے دھوکہ کیوں دیا۔“ رشیدہ کو اپنی روح جسم سے پرواز کرتی معلوم ہونے لگی۔ وہ اس سے آنکھیں چرا رہی تھی۔ ”تم شاید میری آنکھوں کی طرف دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔“ جعفری نے خوفناک آواز میں ہنس کر کہا اور جیب سے تاریک شیشوں کی عینک نکال کر لگالی۔ کچھ دیر رشیدہ کی گھبراہٹ سے غالباً

لطف اندوز ہوتا رہا پھر نرم لہجے میں بولا۔ ”میں نے تمہارے متعلق سب کچھ پتہ لگالیا ہے۔“
رشیدہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

جعفری بولتا رہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ تم نیا اشارہ کے زائد اسٹاف میں تھیں۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم وہاں سے ایک رقم کو خورد برد کر دینے کے الزام میں نکالی گئی ہو۔“

رشیدہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ حقیقتاً انور نے یہی چال چلی تھی۔ غالباً اس کے لئے اسے فریدی سے یہی مشورہ ملا تھا۔ رشیدہ کی علیحدگی کی وجہ غبن دکھائی گئی تھی۔

رشیدہ نے جلد ہی اپنی حالت پر قابو پا لیا اور بڑے مسکین لہجے میں بولی۔ ”پھر میں کیا کرتی۔ کیا بھوکوں مرتی۔ اگر میں علیحدگی کی اصل وجہ ظاہر کر دیتی تو مجھے کون ملازم رکھتا۔“
”کتنی رقم تھی؟“

”صرف ساڑھے تین سو روپے جو میں نے ایک سول ایجنٹ سے زر ضمانت کے طور پر وصول کر کے بعض ضروریات پر صرف کر دیئے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ تھوڑا تھوڑا کر کے کسی طرح ٹھیک کر دوں گی۔ مگر اچانک اس ایجنٹ کی ملاقات براہ راست منیجر سے ہو گئی۔“

”خیر.... فکر نہ کرو۔ مجھے توقع ہے کہ تم کم از کم میرے ساتھ اسیانہ کرو گی۔ ویسے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم بڑی دلیر لڑکی ہو اور میں کم از کم ہر دلیر فرد کو دولت مند دیکھنا پسند کرتا ہوں۔“
”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ رشیدہ نے کہا۔

جعفری نے ایک ویٹر کو اشارے سے بلا کر کافی کے لئے کہا اور پھر رشیدہ کی طرف مڑ کر بولا۔ ”میں تمہیں دولت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”جی....!“ رشیدہ کا دل پھر دھڑکنے لگا تھا۔ لیکن اس بار وجہ خوف نہیں تھی، بلکہ اپنے مقصد میں کامیابی کا خیال اس کے ذہن میں جیجان برپا کئے ہوئے تھا۔

”تمہیں دولت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے مخصوص اسٹاف میں جگہ دینے کے متعلق غور کر رہا ہوں۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ رشیدہ کی آواز کپکپا رہی تھی۔
”لیکن لڑکی! ایک بات ذہن میں رکھنی پڑے گی کہ تم مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کرو گی۔“
”دھوکا! نہیں کبھی نہیں۔ دھوکہ تو میں نے انہیں بھی نہیں دیا۔ میری نیت درست تھی۔“

میں کسی نہ کسی طرح وہ رقم ضرور پوری کر دیتی۔“

جعفری تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

”تمہیں میرے لئے تھوڑی سی سراغ رسانی کرنی پڑے گی۔“

”سراغ رسانی۔“ رشیدہ چونک پڑی۔

”ہاں! دفتر ہی میں۔“ جعفری پر خیال انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ میرے دفتر

میں بھیڑوں کی کھال میں کچھ بھیڑے بھی گھس آئے ہیں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”اس شہر میں میرے کچھ حریف بھی ہیں جو مجھے نقصان پہنچانے پر تلے رہتے ہیں۔ تلاشی

والا واقعہ تم بھولی نہ ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ دفتر ہی کے کسی فرد کے اشارے پر ہوا تھا۔“

”اوہ.... لیکن....!“

”مجھے یقین ہے کہ یہی بات ہے۔“ جعفری ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”کل سے تمہاری تنخواہ پانچ سو

روپے ماہوار لگے گی اور اس سراغ رسانی کے سلسلے کے اخراجات الگ.... بولو! کر سکو گی۔“

”ضرور کر سکو گی۔“ رشیدہ بڑبڑائی۔ ”پانچ سو روپے۔ آپ بہت اچھے ہیں اور آپ اتنی نہ

بھی دیتے تو میرا فرض تھا۔ مالک کے نمک حراموں کو جہنم رسید ہی ہونا چاہئے۔“

”مجھے تم سے یہی توقع تھی۔“ جعفری مسکرا کر بولا۔

”دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہے“ پھر جعفری بولا۔ ”یہ راؤنڈ ختم ہونے سے پہلے ہی

ہمیں اٹھ جانا ہے میں تمہیں اس وقت ایک ایسے شخص سے ملانا چاہتا ہوں جس کے پیچھے تم کل ہی

سے لگ جاؤ گی۔“

”بہتر ہے۔“ رشیدہ نے جلدی جلدی کافی پی اور پھر جعفری بل ادا کر کے اٹھا۔ دونوں دوسرے

دروازے سے باہر نکل آئے۔ جعفری کی کار قریب ہی کھڑی تھی۔ اُس نے اگلی سیٹ کی کھڑکی

کھولی اور رشیدہ اس کا شکریہ ادا کر کے اندر بیٹھ گئی۔ جعفری اُس کے برابر بیٹھ کر اسٹیرنگ کرے

لگا۔ کار شہر کی سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ رشیدہ نے موج میں آکر راحیلہ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

”میں جانتا ہوں وہ بڑی ایماندار لڑکی ہے۔“ جعفری بولا۔

”آپ سے ڈرتی بہت ہے۔“

”میں دیدہ دانستہ اس پر سختی کرتا ہوں۔“

”کیوں؟“

”کافی خوبصورت لڑکی ہے اگر کسی جال میں پھنس گئی تو.... اس کا خاندان تباہ ہو جائے گا۔“

اس کی بیوہ اندھ سی ماں....!“

”آپ جانتے ہیں۔“

”کیوں نہیں۔“ جعفری بولا۔ ”میں اسی لئے اس پر سختی کرتا ہوں کہ وہ سنگھار کرنا چھوڑ دے۔ دفتر کے کئی کلرکوں نے اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں نے معاملات کو آگے نہ بڑھنے دیا۔“

”سچ سچ آپ فرشتہ ہیں۔“

کارشہر کی ایک ویران سڑک پر جا رہی تھی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں۔“ دفعتاً رشیدہ چونک کر بولی۔

”بس اب دور نہیں ہے۔ میں دراصل ایک آدمی کی عدم موجودگی میں تمہیں اُس سے ملانا

چاہتا ہوں۔“

رشیدہ خاموش ہو گئی مگر اس کا دل دھڑکنے لگا۔

”کیا تم ڈر رہی ہو۔“ جعفری ہنس کر بولا۔ ”میری نظروں میں عورتوں کا بہت احترام ہے۔“

اس نے یک بیک ایسی شکل بنائی جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ دفعتاً اس نے رشیدہ سے

کہا۔ ”کیا کارڈ رائیو کرنا جانتی ہو۔“

”جی ہاں۔“

”اچھا تو چند منٹوں کے لئے اسٹیرنگ سنبھال لو۔“

رشیدہ نے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھا اور وہ اچھل کر پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔

”فکر مت کرو، اسٹیرنگ کرتی رہو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ پچھلا شیشہ گرا کر اندھیرے میں گھورنے لگا۔ بہت دور سڑک پر ایک بہت بڑا اور متحرک

تاریک دھبہ ساد کھائی دے رہا تھا یہ دراصل ایک کار تھی۔ جس کے ہیڈ لائٹس روشن نہیں

تھیں۔ غالباً جعفری کی کار کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ جعفری نے سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک

رائفل نکالی جس کی نال میں نیچے کی طرف ایک بڑی سی نارچ فٹ تھی۔

”چلتی رہو۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”ڈراما میں فائر کرنے جا رہا ہوں۔“

”کیوں....؟“ رشیدہ کانپ کر بولی۔

”چغفوری کمپنی کا کوئی آدمی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔“

”قتل! نہیں نہیں۔“ رشیدہ بوکھلا گئی۔

”اوہ....!“ جعفری غرایا۔ ”میں صرف اس کی کار کا ایک نار پھاڑنے جا رہا ہوں۔“

اُس نے رائفل سیدھی کی۔ ٹریگر پر انگلی رکھتے ہی نارچ روشن ہو گئی اور ساتھ ہی فائر بھی ہوا۔ گولی تعاقب کرنے والی کار کے اگلے پہرے پر لگی تھی۔

غیر ارادی طور پر رشیدہ کا ہاتھ گیر پر جا پڑا۔۔۔ اور کار کی رفتار کم ہو گئی۔

”کیا کر رہی ہو۔“ جعفری غرایا اور رشیدہ کو رفتار پھر تیز کر دینی پڑی۔ جعفری پھر بولا۔

”بہت ڈر پوک ہو تم۔“

”مجھے کشت و خون سے دلچسپی نہیں۔“ رشیدہ نے کہا۔

”تو کیا میں خونی ہوں۔“ جعفری بگڑ کر بولا۔

”جی نہیں۔“ رشیدہ نے جلدی سے کہا۔

جعفری پھر اگلی سیٹ پر آ بیٹھا اور کار ڈرائیو کرنے لگا۔

”مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم پہلے کسی زمانہ میں پولیس سے مل کر کام کیا کرتی تھیں۔ اب بھی

کرتی ہو یا نہیں۔“ جعفری اس کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔

”حالات پر منحصر ہے۔“ رشیدہ نے بے پروائی سے کہا لیکن اس کا دل پھر دھڑکنے لگا تھا۔

”انور تمہارا شوہر ہے۔“

”نہیں صرف دوست ہے۔“

”بڑے کام کا.... آدمی ہے اگر اُسے بھی میرے ہی فرم میں لے آؤ تو کیا حرج ہے۔“

”ہرگز نہیں۔ بلکہ میں آپ سے یہ استدعا کروں گی کہ میری تنخواہ میں اضافے کا علم اُسے نہ

ہونے پائے۔“

”کیوں....؟“

”میرے زیادہ تر روپے وہی ہضم کر لیتا ہے اور اب تو مجھے اس سے کچھ کچھ نفرت سی ہو چلی ہے۔
نیو اسٹار کے دفتر والی رقم دراصل اسی پر صرف ہوئی تھی۔ اس سونے میری ذرا بھی مدد نہ کی۔“

”تو تم اس سے الگ ہونا چاہتی ہو۔“

”میں تو چاہتی ہوں لیکن وہ میرا پیچھا نہ چھوڑے گا۔“

”اور اگر میں چھڑا دوں تو۔“

”عمر بھر آپ کا احسان مانوں گی۔“

”اچھا میں کوشش کروں گا۔ ویسے وہ سو فیصدی پولیس کا پٹو ہے۔“

”ایسا تو نہیں.... وہ پولیس والوں سے رقم اینٹھنا خوب جانتا ہے۔ انہیں اس بُری طرح بلیک

میل کرتا ہے کہ خدا کی پناہ۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ جعفری نے کہا اور کاری کی رفتار سست ہو گئی۔ تھوڑی دور چل کر ایک

کچے راستے پر مڑی اور شاید ایک یا ڈیڑھ فرلانگ کی مسافت طے کرنے کے بعد رک گئی۔ جعفری
اُتر پڑا۔ رشیدہ بھی اتری لیکن سہمی سہمی سی نظروں سے اندھیرے میں گھور رہی تھی۔ یہاں
چاروں طرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں نظر آرہی تھیں اور سامنے ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کی
کھڑکیوں سے زرد رنگ کی ہلکی روشنی چھن رہی تھی۔ دونوں مکان میں داخل ہوئے اور جعفری
نے دروازہ بند کر کے ایک دشتاک تہقبہ لگایا۔

رشیدہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ جعفری کی آنکھیں حد درجہ بھیاک نظر آنے لگی تھیں۔

”کیوں چوہا۔“ اُس کی غراہٹ بلند ہو گئی۔ ”تو ایک بھیڑیے کو راستہ دکھانے کی کوشش

کر رہی تھی۔“

رشیدہ چیخ مار کر ایک صوفے پر گر گئی۔

جعفری نے پھر ایک تہقبہ لگایا لیکن یہ تہقبہ معنوی اعتبار سے تہقبہ ہرگز نہیں تھا۔ ایسا

معلوم ہوا جیسے کوئی شیر دھاڑ کر رہ گیا ہو۔

رشیدہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے پڑی تھی۔

”فریدی ہی نے بھیجا تھا نا تجھے۔“

”نہیں.... نہیں.... یہ جھوٹ ہے۔“ رشیدہ خوفزدہ آواز میں چیخی۔

”مجھے جھوٹا کہتی ہے۔“

”ہاں....؟“

”کیا....؟“

”نہیں نہیں....!“

”تیرے جسم کا ایک ایک ریشہ الگ کر دوں گا اور کسی کو کانوں کان تک خبر نہ ہوگی۔“

ریشہ کچھ نہ بولی اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس پر غشی طاری ہو رہی ہو۔

”بتاؤ! فریدی کہاں ہے؟“ جعفری نے اس کی گردن ٹٹولتے ہوئے کہا اور پھر اس کی گرفت

خفت ہو گئی۔

”بتاتی ہوں۔“ ریشہ گھٹی گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی اور جعفری نے اُس کی گردن چھوڑ دی۔

”میں نہیں جانتی۔“ اُس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”پانی.... پانی۔“

”تم نہیں جانتیں۔“

”ہاں اس نے مجھے ایک خط کے ذریعے آپ کے یہاں ملازمت کرنے کا مشورہ دیا تھا۔“

”اور تم نے ملازم ہوتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ کیوں کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ شہر میں جتنے بھی

قتل ہوئے ہیں ان میں میرا ہاتھ ہے۔“

”یہ میں نہیں جانتی۔ اس نے صرف یہ لکھا تھا کہ میں ہوشیاری سے سب کچھ دیکھتی اور سنتی

رہوں۔“

”تمہارے علاوہ اور بھی کوئی ہے۔“

”میں نہیں جانتی۔“

”خیر.... اب اس وقت تک تمہاری رہائی ناممکن ہے جب تک تم یہ سب کچھ اگل نہ دو۔“

جعفری نے ریشہ کی گردن پکڑ کر اسے سیدھا کھڑا کر دیا اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر

لے جا کر انہیں ایک پتلی سی ڈور سے باندھنے لگا۔ دفعتاً دونوں پر ایک بہت ہی تیز قسم کی روشنی

پڑی اور فوراً ہی غائب ہو گئی۔ جعفری غراتا ہوا کھڑکی کی طرف جھپٹا۔ باہر بدستور تاریکی پھیلی

ہوئی تھی۔ اس نے کھڑکی کے باہر چھلانگ لگادی۔ پھر وہ دیوانوں کی طرح قرب وجوار میں گھستا

پھر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہانپتا ہوا کمرے میں واپس آگیا۔ ریشہ کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے

ہوئے تھے.... اور.... وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔

”تمہارے حمایتی۔“ وہ گرج کو بولا۔ ”لیکن دیکھنا ہے کہ وہ تمہیں یہاں سے کس طرح لے جاسکتے ہیں۔ پولیس.... ہوں.... پولیس میرے نزدیک بے جان کھلونا ہے، جس کی اسپرنگ جب چاہوں توڑ دوں۔ تلاشی میں کیا ملا تھا انہیں اور تم نے کیا دیکھا تھا.... ہینہہ....!“

گرفتاری اور فرار

رشیدہ کو غائب ہوئے دس دن گزر گئے تھے۔ اس دوران میں انور نے جیس اینڈ جعفری کا پورا دفتر بلا کر رکھ دیا لیکن کوئی نتیجہ نہ برآمد ہوا۔ جعفری نے رشیدہ سے جو کچھ بھی کہا تھا سچ کر دکھایا۔ پولیس اس کا بال بھی بیکانہ کر سکی۔ ایک طرف اس نے خود محکمہ پولیس ہی پر ہر جانے اور ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر رکھا تھا اور دوسری طرف رشیدہ کے خلاف ایک رپورٹ بھی درج کرائی تھی۔ اس نے اس پر الزام لگایا تھا کہ وہ اس کی تجوری کا تالا توڑ کر پندرہ ہزار روپے کے نوٹ نکال لے گئی ہے ثبوت میں اس نے رشیدہ کا ہینڈ بیگ پیش کر دیا جو اسے ٹوٹی ہوئی تجوری کے پاس ہی پڑا ملا تھا۔ تجوری کے ہینڈل پر رشیدہ کے انگلیوں کے نشانات تک مل گئے۔ یہ تجوری اسی کے کمرے میں رکھی رہتی تھی۔ اس واقعے والی شام کو جعفری نے رشیدہ کو تجوری کی کنجی دے کر اس میں سے کچھ نکالنے کو کہا تھا۔ اس طرح تجوری کے ہینڈل پر اس کی انگلیوں کے نشانات باقی رہ گئے تھے اور جعفری نے اُس وقت تک انکی حفاظت کی تھی جب تک پولیس نے انہیں دیکھ نہیں لیا تھا۔

نہ صرف انور بلکہ حمید اور اس کے دوسرے ساتھی بھی اس کے لئے سرگرداں تھے۔ البتہ فریدی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب تو حمید کو بھی اس کا علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے؟ حمید کو یقین کامل تھا کہ رشیدہ کو جعفری ہی نے غائب کیا ہے کیونکہ اس نے ان دونوں کو وقوعے والی رات کو آر لکچو میں ساتھ دیکھا تھا۔ اسے اب رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے ان دونوں پر نظر کیوں نہ رکھی۔ اس دوران میں بھی کئی حادثات رونما ہوئے تھے۔ ڈی۔ آئی۔ جی کی ہدایت کے مطابق ڈاکٹر نارنگ نے اپنا دیہی بگلہ خالی کر دیا تھا اور ڈی۔ آئی۔ جی نے اس کی نگرانی کرنے کے لئے محکمہ سراغ رسانی کے دو انسپکٹر مقرر کر دیئے تھے لیکن دوسری صبح ان دونوں کی لاشیں ملیں۔ اُن کے

سر بڑی بے دردی سے کچلے گئے تھے اور لاشیں راستے پر ڈال دی گئی تھیں اسی رات کو ڈاکٹر نارنگ پر ایک بار پھر حملہ ہوا۔ اس کے بیان کے مطابق جب وہ رات کا کھانا کھا کر پائیں باغ میں ٹہل رہا تھا تو کسی نے اس پر چھڑے سے حملہ کیا اور اس کا داہنا بازو زخمی ہو گیا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ حملہ آور کو پہچان نہیں سکا تھا۔ اگر وہ لڑنے پر آمادہ نہ ہو گیا ہوتا تو حملہ آور دوسرا وار ضرور کرتا۔ اس کے نوکروں نے اس کی چیخ سنی تھی۔

ان حادثات کے بعد ڈاکٹر نارنگ کے دیہی بنگلے اور شہری رہائش گاہ پر مسلح پولیس کا پہرہ لگا دیا گیا۔ لیکن ایک رات بنگلے کے پہرے داروں پر کسی نامعلوم آدمی نے دیسی بم پھینکے۔ نتیجے کے طور پر ایک ہلاک ہو گیا اور تین کے گہرے زخم آئے۔ البتہ اس کی شہری رہائش گاہ پر پھر کوئی حادثہ نہیں ہوا۔

اب تو ڈی۔ آئی۔ جی کو بھی فریدی پر تاؤ آنے لگا تھا۔ محکمہ سراغ رسانی پر چاروں طرف سے بوچھاڑیں ہو رہی تھیں۔ حکومت نے پورے ملک کے بہترین داغ ایک جگہ اکٹھا کر دیئے تھے لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ پھر یہ خبر بھی گشت کرنے لگی تھی کہ حکومت عنقریب برطانوی حکومت سے استدعا کر کے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے نامور جاسوسوں کی خدمات حاصل کرنے والی ہے۔ ڈی۔ آئی۔ جی اپنے آفس میں بیٹھا بری طرح کھول رہا تھا کہ چہرے اسی نے ایک کارڈ لا کر پیش کیا۔ ڈی۔ آئی۔ جی پیشانی پر شکنیں ڈالے اس کارڈ کو چند لمحے گھورتا رہا پھر جھنجھلائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آئے دو۔“

نیو اسٹار کا کرائم رپورٹر انور سعید چچ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔
”بیٹھ جاؤ۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے مضطربانہ انداز میں کہا جس میں جھنجھلاہٹ بھی شامل تھی۔
”وہ لڑکی ملی یا نہیں۔“

”وہ تو نہیں ملی۔“ انور نے کہا۔ ”لیکن اس کا سراغ معہ ثبوت مل گیا ہے۔“

”یعنی....!“ ڈی۔ آئی۔ جی نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

انور نے جیب سے ایک تصویر نکال کر اس کی میز پر رکھ دی۔

”یہ کیا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی اس پر جھکتا ہوا بولا پھر سیدھا ہو کر انور کو گھورنے لگا۔ انور کچھ نہ بولا۔

”بولتے کیوں نہیں، یہ کون ہے؟“ ڈی۔ آئی۔ جی نے جھنجھلا کر پوچھا۔

”جیس اینڈ جعفری کا جنرل منیجر جعفری.... اور دوسری رشیدہ ہے۔“

”اوہ....!“ ڈی۔ آئی۔ جی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”اور غالباً یہی مسٹر کیو ہے۔“ انور بولا۔ ”اُسے کسی طرح علم ہو گیا کہ رشیدہ کو فریدی صاحب نے اس کی فرم میں ملازمت کرنے کی ترغیب دی تھی لہذا اس نے اُسے غائب کر دیا اور اُس کی چالاکیوں سے تو آپ واقف ہی ہوں گے کہ اس نے کس طرح پولیس پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کیا ہے اور کس خوش اسلوبی سے رشیدہ کو چور ثابت کر کے اس کے خلاف رپورٹ بھی درج کرا دی ہے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی اس تصویر کو برابر گھورے جا رہا تھا۔ یہ جعفری اور رشیدہ کی تصویر تھی جس میں وہ رشیدہ کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر باندھ رہا تھا۔

”تمہیں یہ ملی کہاں سے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”ایک خط کے ساتھ فریدی صاحب کی طرف سے موصول ہوئی ہے۔“

”فریدی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی چونک کر بولا۔ ”وہ ہے کہاں.... خط لاؤ۔“

”پتہ نہیں.... وہ کہاں ہیں۔“ انور جیب سے خط نکالتا ہوا بولا۔ ”دستی خط.... آر لکچو کے ویٹر سے ملا تھا۔“

کاغذ پر صرف دو سطریں تحریر تھیں۔

”تصویر بھیج رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ تم صحیح نتیجے پر پہنچو گے اُسے ڈی۔ آئی۔ جی صاحب کے پاس لے جاؤ....“ ف۔“

”مائی گاڈ....!“ ڈی۔ آئی۔ جی حیرت سے بولا۔ ”تو یہی شخص مسٹر کیو ہے۔“

”میرا تو یہی خیال ہے۔“ انور نے کہا۔

”اچھا تو تم جاؤ۔“ ڈی۔ آئی۔ جی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”اخبار میں اس کے متعلق کچھ نہیں آنا چاہئے۔“

”بہتر ہے۔“ انور نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

دوسرا لمحہ ڈی۔ آئی۔ جی کے لئے انتہائی ہیجان آفریں تھا۔ وہ خط اور تصویر لئے ہوئے آئی۔ جی کے دفتر کی طرف لپکا۔

پھر آدھے گھنٹے کے اندر ہی اندر جیس اینڈ جعفری کے دفتر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ کسی کو سانس

لینے کی مہلت بھی نہ ملی لیکن خود جعفری کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پولیس نے عمارت کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ جعفری کے کمرے والا تہہ خانہ بھی دیکھا گیا لیکن لا حاصل.... دفتر کا سارا عملہ حراست میں لے لیا گیا۔ ڈی۔ آئی۔ جی کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے منہ پر تھپڑ مارے۔ جلدی میں اس نے ایک زبردست غلطی کی تھی۔ محاصرے سے پہلے اسے معلوم کر لینا چاہئے تھا کہ جعفری دفتر میں موجود بھی ہے یا نہیں۔ آئی۔ جی بھی اس کے سر الزام تھوپ رہا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی عقل رکھتا تھا۔ اس کش مکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند لمحوں کے بعد وہ دونوں ہی متفقہ طور پر فریدی کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔

”کیا حماقت کی ہے اس لونڈے نے خود کو نہ جانے کیا سمجھ رکھا ہے۔“ آئی۔ جی بولا۔
 ”میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ آخر اس کرائم رپورٹر کو تصویر بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔“
 ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ ”خود آرائی کا نتیجہ ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔“

”بہت ہو چکا۔“ آئی۔ جی پھنکارا۔ ”پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ میں آج ہی اسے معطل کرتا ہوں اور ساتھ ہی اس کی گرفتاری کا وارنٹ بھی جاری کراؤں گا۔ بہت سر چڑھایا گیا ہے۔ میں کسی ایسے آدمی کا وجود اپنے منکے میں برداشت نہیں کر سکتا جو ڈسپلن پر قرار نہ رکھ سکے۔“
 ڈی۔ آئی۔ جی کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے ریسپورڈ اٹھا لیا۔ چند لمحے برا سامنے بنائے ہوئے سنتا رہا پھر ایک طویل ”اچھا“ کے ساتھ ریسپورڈ بٹخ دیا۔

آئی۔ جی سوالیہ انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہ تو جان ہی کو آگیا ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بڑبڑایا۔

”کون....؟“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”ڈاکٹر نارنگ.... اب نہ جانے کون سی آفت ٹوٹی ہے کہ بلارہا ہے۔“

”ابھی کیا ہے! یہ سارے لیڈر ناطقہ بند کر دیں گے۔ فریدی کے لونڈا اپن کی وجہ سے بنا بنایا

کھیل بگڑ گیا۔“

ڈی۔ آئی۔ جی دو انسپکٹروں کے ساتھ ڈاکٹر نارنگ کی کونٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر

نارنگ برآمدے میں کھڑپائیں باغ میں پھیلے ہوئے کبوتروں کے لئے دانہ ڈال رہا تھا۔

”فرمائیے۔“ میں آج بہت مشغول ہوں۔ ڈی۔ آئی۔ جی اس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

”کیا؟ میں نہیں سمجھا!“ ڈاکٹر نارنگ نے حیرت سے کہا۔

”آپ نے فون کیا تھا مجھے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی جھنجھلا کر بولا۔

”میں نے.... نہیں تو۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بے بسی سے بولا۔ ”وہ مسٹر کیو بھی ہاتھ آتے

آتے رہ گیا۔“

”کیا کیسے.... یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ اندر چلئے۔“ ڈاکٹر نارنگ بولا۔

وہ لوگ ملاقاتی کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

”کیا مسٹر کیو کی شخصیت ظاہر ہو گئی۔“ ڈاکٹر نارنگ نے پوچھا۔

”جی ہاں! لیکن اسے فی الحال اپنے ہی تک محدود رکھئے گا۔ سر دست تو وہ نکل بھی گیا ہے۔

لیکن زیادہ دیر تک نہ بیچ سکے گا۔ سارے ملک میں وائرلس کے ذریعہ اس کا حلیہ جاری کر دیا گیا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“

”جیمس اینڈ جعفری کا جنرل منیجر جعفری۔“ ڈی۔ آئی۔ بولا۔

قبل اس کے کہ ڈاکٹر نارنگ کچھ کہتا کمرے کے ایک گوشے میں غراہٹ سی سنائی دی۔

”جعفری حاضر ہے۔“

وہ سب چونک کر مڑے۔

جعفری ایک دروازے میں کھڑا انہیں خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں

ریوالور تھا۔ جس کا رخ انہیں کی طرف تھا۔ وہ چاروں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

”کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“ جعفری غرایا۔ ”مسٹر کیو پر ہاتھ ڈالنا آسان کام

نہیں۔ ڈی۔ آئی۔ جی صاحب۔“

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سبھوں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ البتہ ڈاکٹر نارنگ کے ہونٹوں پر عجیب

طرح کی مسکراہٹ تھی۔ جعفری نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ہتھکڑیوں کا جوڑا نکالا اور

اسے ایک انپیکٹر کی طرف اچھالتا ہوا بولا۔ ”اپنے ڈی۔ آئی۔ جی اور ڈاکٹر نارنگ کے ہاتھوں میں

لگا دو.... چلو.... جلدی کرو۔“

انپیکٹر نے طوعاً و کرہاً ایک ہتھکڑی ڈی۔ آئی۔ جی کے اور دوسری ڈاکٹر نارنگ کے ہاتھ میں

ڈال دی۔ دوسرے سب انسپکٹر کا ہاتھ جیب کی طرف جا ہی رہا تھا کہ جعفری نے اسے لٹکارا۔
 ”خبردار میں سر سے پیر تک آنکھیں ہی آنکھیں رکھتا ہوں۔“

”یہ کیا لغویت ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی جھلا کر چیخا۔

”سرکار ناراض نہ ہوں۔“ جعفری قدرے جھک کر بولا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کے سر پر تھا اس نے اپنے بال مٹھی میں جکڑے اور ایک جھراٹا سا مارا۔ بالوں کے ساتھ چہرے کی کھال بھی اترتی چلی گئی اور جب وہ سیدھا ہوا تو ڈی۔ آئی۔ جی اور دونوں انسپکٹر بے ساختہ چیخ پڑے۔ ”فریدی۔“
 دفعتاً ڈاکٹر نارنگ ڈی۔ آئی۔ جی پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں کے داہنے اور بائیں ہاتھ ایک ساتھ جکڑے ہوئے تھے اور دوسرے دائیں بائیں آزاد تھے۔ دونوں ایک ساتھ زمین پر آرہے۔ قبل اس کے کہ وہ لوگ سنبھلتے ڈاکٹر نارنگ اٹھ کر بھاگا۔ پتہ نہیں اس نے کس طرح اپنا ہاتھ ہتھکڑی سے نکال لیا تھا۔ ہتھکڑی بدستور بند تھی۔ فریدی ڈاکٹر نارنگ کے پیچھے دوڑا۔ اس کے پیچھے وہ تینوں بھی بھاگے۔ وہ سارے کمروں میں ناچتے پھر رہے تھے اور ڈاکٹر نارنگ کا کہیں پتہ نہ تھا۔
 ”میں بھی شاید پاگل ہو گیا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور ایک سمت دوڑنے لگا۔ ایک کمرے میں پہنچ کر وہ ایک لحظہ کے لئے رکا۔ یہاں ایک میز الٹی پڑی تھی غالباً وہ دیوار سے لگی رہی ہوگی۔
 ”یہ ہتھکڑی لو۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے اپنے ہاتھ میں جھولتی ہوئی ہتھکڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ایک انسپکٹر نے آگے بڑھ کر ہتھکڑی نکال دی۔

فریدی دیوار سے لگے ہوئے ایک ایک ریک پر زور آزمائی کر رہا تھا۔ دفعتاً ریک اپنی جگہ سے کھسک کر ایک طرف ہو گیا۔ سامنے دروازہ تھا وہ چاروں دیوانہ وار اندر گھسے۔

”بڑا غلط طریقہ تھا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بڑبڑا رہا تھا۔

”جناب والا۔“ فریدی نے مزے بغیر کہا۔ ”آپ محاصرہ کر کے تو اسے پکڑ ہی نہیں سکتے تھے۔ اس عمارت کے نیچے سرنگوں اور تہہ خانوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ گھبرائیے نہیں! میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں گیا ہوگا۔“

وہ ایک کشادہ سرنگ میں دوڑ رہے تھے۔ اُن میں سے ہر ایک کچھ نہ کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن ان کے دم گھٹ رہے تھے۔ سرنگ تاریک اور متعفن تھا۔

”لیکن سنو تو سہی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بانپتا ہوا بولا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں۔“

”باٹم روڈ پر نکلیں گے۔ موٹروں کے کارخانہ کے پاس۔ گھبراہٹ نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ وہیں گیا ہوگا۔ موٹروں کا کارخانہ اسی کا ہے۔ اس نے وہاں سے ایک موٹر لی ہوگی اور سیدھا ساگر مینشن گیا ہوگا۔“ فریدی نے کہا۔

”مجھے تو اب بھی یقین نہیں آرہا ہے کہ وہ مسٹر کیو ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔
 ”اس سرنگ میں دوڑتے وقت بھی نہیں۔“ فریدی کے لہجے میں تمسخر تھا۔ آئی۔ جی کچھ نہ بولا۔
 ”آخر اتنا دھم مچانے کی کیا ضرورت تھی۔“ ایک انسپکٹر بولا۔

”اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔“ فریدی بولا۔ ”ذرا رقتار اور تیز کیجئے۔“
 تھوڑی دیر بعد انہیں روشنی دکھائی دی۔ پھر تین زینوں پر نظر پڑی دوسرے لمحے میں وہ باہر تھے ایک بڑا سا پتھر ایک طرف پڑا تھا جو غالباً ڈاکٹر نارنگ کے نکلنے سے پہلے سرنگ کے دہانے پر رکھا رہا ہوگا۔ چاروں طرف کروندے کی کانٹے دار اور بے ترتیب جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ انہوں نے بروقت تمام راستہ بنایا اور باہر نکلے۔ سڑک زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے جنرل موٹر گیران تک آئے۔ کم از کم ڈی۔ آئی۔ جی کے لئے تو یہ نئی اطلاع تھی کہ وہ گیران ڈاکٹر نارنگ ہی کی ملکیت تھا۔ گیران کا منتظم باہر ہی مل گیا۔
 ”ڈاکٹر صاحب آئے تھے۔“ فریدی نے اس سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے کہا۔

”تہا ہی تھے۔“ فریدی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ گیران کا منتظم دونوں انسپکٹروں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ انہوں نے ریوالور اور کار تو سوں کی پیٹیاں لگا رکھی تھیں۔ منتظم نے جواب میں سر ہلادیا۔

”آف فوہ۔“ فریدی نے بے چینی سے کہا۔ ”انہیں منع کیا گیا تھا کہ تہا باہر نہ نکلیں۔ کتنا خطرہ ہے ان کے لئے.... کدھر گئے۔“

”ایک کار لے کر اُدھر گئے ہیں۔“ منتظم نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”کوئی اور گاڑی فالتو ہے۔“

”جی ہاں ہے۔“

”فون بھی ہے یہاں.... اچھا ذرا گاڑی جلدی سے نکلو ایسے۔ ان کی جان کو خطرہ ہے۔“

فریدی مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملنے لگا۔

”فون ہے! آئیے۔“ منتظم گھبرا گیا تھا۔ فریدی نے فون پر ہاتھ ڈالا۔

”ہیلو.... کو تو ملی.... ڈی۔ آئی۔ جی آف انٹیلی جنس اسپیکنگ.... ساگر مینشن کا محاصرہ فوراً

کر لیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ آدمیوں سمیت.... فوراً.... جلدی۔“

ریسیور رکھ کر فریدی باہر بھاگا۔ کار باہر کھڑی تھی۔ اس نے جھپٹ کر اسٹیرنگ سنبھالا اور

اس کے ساتھی بھی بیٹھ گئے۔ کار تیزی سے نیلی روڈ کی طرف مڑی اور دونوں انسپکٹروں کے سر

ایک دوسرے سے ٹکرائے۔

لاشوں کی بارش

”اُف فوہ! کتنا بے وقوف بنے ہیں ہم لوگ.... اس کی گرفتاری کے بعد بھی شاید کسی کو

مشکل ہی سے یقین آئے کہ وہ خود ہی مسٹر کیو ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔

”میرے پاس ثبوتوں کا انبار عظیم ہے۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا۔

”حمید کہاں ہے۔“

”پتہ نہیں! ہوگا کہیں۔“ فریدی بولا۔ ”اس بار میں نے انہیں بھی دھوکے میں رکھا ہے

جنہیں خود ہی کام پر لگایا تھا۔“ ایک لمحے کے لئے خاموشی رہی پھر فریدی نے کہا۔

”حمید تک کو اس کا علم نہیں کہ مسٹر کیو کون ہے۔ وہ اب بھی جعفری کی تلاش میں ہوگا۔“

”لیکن.... کیوں؟“

”اطمینان سے عرض کروں گا۔ فی الحال تو میں بھی امید و بیم کی حالت میں ہوں۔“

”اگر نکل گیا تو بہت بُرا ہوگا۔“

”ساگر مینشن کے علاوہ اور کہیں نہیں جاسکتا۔“ فریدی نے کہا۔

”یقین کی کوئی وجہ۔“

”ہیڈ کوارٹر وہی ہے پانچ دنوں سے متواتر میں اسی چکر میں رہا ہوں اور یقیناً واقف ہو جانے پر

اُن اقدام کا فیصلہ کیا تھا۔ اُف فوہ! آج تو یہ فاصلہ کسی طرح کم ہی نہیں ہو رہا ہے۔“

”دیکھو گرفتار کم کرو۔ ہم شہر کے آباد حصے میں داخل ہو رہے ہیں۔“

”غالباً پولیس اب تک وہاں پہنچ گئی ہوگی۔“ فریدی نے رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن تم نے فون پر! آف فوہ.... بڑی غلطی کی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بے چینی سے پیشانی
 رگڑنے لگا۔

”جی.... کیسی غلطی۔“

”تم نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ نارنگ ہی مسٹر کیو ہے۔ اگر وہ انہیں دھوکہ دے کر نکل گیا تو۔“
 ”مجھے یقین ہے کہ اگر وہاں پولیس پہنچ بھی گئی ہوگی تو ابھی شاید ہی عمارت میں داخل ہو سکی ہو۔“
 ”کیوں؟“

”وہاں مسٹر کیو کے ساتھ ستر آدمی رہتے ہیں اور ڈائمنڈ نارنگ کا ذہنی توازن فی الحال بگڑ گیا
 ہے ورنہ وہ اس طرح نہ بھاگتا۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنا متاثر آدمی تھا۔ خود اس کے آدمیوں کو اس کا علم
 نہیں کہ مسٹر کیو کون ہے۔ اس نے ہر طرح اپنی مضبوطی کر رکھی تھی۔ اگر وہ اس طرح نہ بھاگتا تو
 اسے مجرم ثابت کرنے میں مجھے دانتوں پسینہ آجاتا اور میں نے یہ ڈرامائی انداز محض اس لئے
 اختیار کیا تھا کہ اسے اچانک ذہنی طور پر انتشار میں مبتلا کر دوں اور وہ گرفتاری کے وقت رد عمل
 کے طور پر کوئی اضطرابی حرکت کر بیٹھے مگر مجھے اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ وہ بند بھڑکی سے
 ہاتھ نکال لے گا۔“

”واقعی تم اس سے بھی زیادہ بھیانک ہو۔“ ڈی۔ آئی۔ جی فریدی کا نشانہ تھپکتا ہوا بولا۔ ”اگر
 خدا نخواستہ کہیں تم بھی غیر قانونی راستوں پر نکل گئے ہوتے تو ہم لوگوں کے لئے ایک مستقل درد
 سر ہو جاتے۔“

فریدی ہنسنے لگا۔ دفعتاً اس نے کار کی رفتار بالکل کم کر دی اور ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف دیکھ کر
 آہستہ سے بولا۔ ”سن رہے ہیں آپ۔“

”ارے! یہ تو مشین گنوں کی آوازیں ہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے اچھل کر کہا۔
 ”وہ دیکھئے۔“ فریدی نے سامنے اشارہ کیا۔ سڑک سناں پڑی تھی اور سائبر مینشن سے
 چاروں طرف گولیاں برس رہی تھیں۔ پولیس کا کہیں پتہ نہ تھا۔

فریدی نے بڑی پھرتی سے کار بیک کی۔ اگر وہ دوڑھائی سوز اور آگے بڑھ گئے ہوتے تو کار
 گولیوں کی زد پر آجاتی۔ فریدی نے کار کو اگلی گلی میں موڑ دیا۔ سائبر مینشن مقابل سمت کی اینٹن میں

تھی۔ گلی کے اندر سب سے پہلے آدھیوں کا جھوم تھا اور پولیس والے بھی سراسیمگی کا شکار ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ فریدی کا روک کر کود پڑا۔ وہ سب بھی اترے، اور بھیڑ میں گھستے چلے گئے۔

آگے چل کر ایس۔ پی سے مدد بھیڑ ہو گئی۔ وہ ڈی۔ آئی۔ بی کی طرف بچپنا۔
 ”ہمارے آنے سے قبل ہی گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔“ وہ گھبراہٹ سے لہجے میں بولا۔
 ”میرے خدانہ جانے اتنی لاشیں سائبر مینشن کے سامنے پڑی ہیں۔۔۔ اور۔۔۔ آئیے میرے ساتھ۔“
 ایس۔ پی انہیں لے کر ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔ اوپری منزل پر پہنچ کر اُس نے ایک کمرے کے روشندان کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سب روشندانوں سے جھانکنے لگے۔ یہ عمارت ٹھیک سائبر مینشن کے سامنے تھی اور یہ لوگ اس کے عقبی راستے سے داخل ہوئے تھے۔

روشندانوں سے آنکھیں اگاتے ہی فریدی اور اس کے ساتھیوں کے منہ سے بیک وقت ”ارے“ نکل گیا۔ گولیاں سائبر مینشن کے ان لموں سے نکل رہی تھیں جو غالباً بارش کا پانی نکلنے کے لئے لگائے گئے تھے۔ ایک ایک فٹ باہر نکلے ہوئے مل جن کا جھکاؤ غالباً چمچر ڈگری کے زوایے سے سڑک کی طرف تھا۔

”ایسے ہی مل۔“ ایس۔ پی بولا۔ ”پوری عمارت میں چاروں طرف لگے ہوئے ہیں۔ غالباً چوتھی سمت بھی گولیاں برس رہی ہوں گی۔“

سائبر مینشن کے ٹھیک نیچے فٹ پاتھ پر لاشوں کے ڈھیر تھے۔
 ”مگر وہ لاشیں۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”وہ تو گولیوں کی زد میں نہیں۔ وہاں ان کا ڈھیر کیا معنی رکھتا ہے۔“

”اور۔۔۔ اُف۔“ عمارت کا ایک کلیں آگے بڑھ کر ہانپتا ہوا بولا۔ ”مجھ سے پوچھئے۔۔۔ میرے خدا۔۔۔ میرے جو اس درست نہیں۔ وہ لاشیں سائبر مینشن ہی سے گری ہیں۔ لاشوں کا آبشار۔۔۔ خدا کی قسم۔۔۔ لاشوں کا آبشار۔ وہ اس طرح گری رہی تھیں جیسے بارش ہو رہی ہو۔ سب سے پہلے لاشیں گریں اور پھر۔۔۔ ان لموں سے گولیاں نکلنے لگیں۔ میرا بھائی۔۔۔ ہائے کہیں وہ بھی۔۔۔ نہ مارا گیا ہو۔۔۔ میرے خدا۔۔۔ اس کا کچھ پتہ نہیں۔“

وہ خاموش ہو کر اٹنے پاؤں دوڑتا ہوا نیچے چلا گیا۔ گولیاں برابر سے جاری تھیں۔

فریدی نے ایک بار پھر فٹ پاتھوں پر پڑی ہوئی ایشوں کی طرف دیکھا اور نیچے اتر آیا۔

”تو اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”اب کیا کیا جائے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی پاگلوں کی طرح آنکھیں کال کر بولا۔

”فون..... یہاں اس مہارت میں کوئی فون ہے۔“ فریدی ایس۔ پی کی طرف مڑا۔

”وہ تو ہو گا ہی! یہ بتائیے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔

”مسٹر کیو۔“ فریدی مضطربانہ انداز میں بولا۔ ”وہ اس مہارت میں موجود ہے۔“

ایسا معلوم ہوا جیسے ایس۔ پی پر ہم گر پڑا ہو۔ وہ حیرت سے منہ اور آنکھیں پھاڑے کھڑا رہا۔

”کیوں بھئی! فون ہے یہاں۔“ فریدی ایک آدمی کی طرف مڑا جو مانبا اسی مہارت کا کوئی فرد تھا۔

”جی ہاں! آئیے میرے ساتھ۔“

وہ دونوں تیزی سے اترے۔ دوسرے لمبے میں فریدی کی انکلی ٹیلی فون کے ڈائیکل پر چل رہی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ ”ہیلو... ہیلو۔“

جواب میں ایک خوفزدہ سی نسوانی آواز سنائی دی۔

”ڈاکٹر نارنگ سے کہو۔“ فریدی گرجا۔ ”کب تک گولیاں چلیں گی۔ سائبر مینشن کا ایک متنفس زندہ نہ بچے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ سائبر مینشن ایک سیدھی ساوی سی مہارت ہے۔“

”وہ پاگل ہو گیا ہے۔“ گھنٹی گھنٹی سی آواز آئی۔ ”مجھے بچاؤ..... میں ایک کمرے میں پھنسی پڑی ہوں۔ دروازے پر ایک بڑی وزنی الماری آگری ہے۔ میں اسے ہٹا نہیں پا رہی ہوں۔ مجھے بچائیے۔“

”تم کون ہو؟“ فریدی نے حیرت سے پوچھا۔

”ایک بے بس لڑکی۔ اسے نہیں معلوم کہ میں زندہ بچ گئی ہوں۔ ورنہ وہ مجھے بھی نہ چھوڑے گا..... بچاؤ۔“

”کیا وہ تنہا ہے۔“

”ہاں..... اس نے سمجھوں کو مار ڈالا ہے اور اب ایک مرکزی مشین پر بیٹھا ساری مشینیں گنوں کو کنٹرول کر رہا ہے۔ خدا رکھی طرح آؤ۔ وہ پاگل ہو گیا ہے میں نہیں جانتی کہ اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے۔“

”وہ.... وہی تمہارا مسٹر کیو ہے۔ تم کنول تو نہیں۔“

”جی ہاں.... جی ہاں.... آپ کون ہیں.... کہاں سے بول رہے ہیں۔“

”فریدی.... چپ چاپ پڑی رہو۔ وہ کس کمرے میں ہے۔“

”الانبریری کے قریب والے میں جس میں مشینیں فٹ ہیں۔ فریدی صاحب خدا کے لئے مجھے بچائے۔ اس نے سب کو مار ڈالا نادرہ.... کرمل کی بہن کو بھی۔“

”لیکن.... اس نے تمہارا.... ان سبھوں کو کس طرح مار ڈالا۔“

”اوہ.... بڑے خوفناک طریقے سے۔ اس نے عمارت میں داخل ہوتے ہی سبھوں کو اکٹھا

کیا اور کہا کہ مسٹر کیو کا حکم ہے کہ تم سب اوپر چلو۔ پھر اس نے ان سبھوں کو اوپر ہی منزل پر لے جا کر چھت کے سرے پر کھڑا کیا۔ خدا کی پناہ میں بھی انہیں میں تھی۔ پھر اچانک اس نے ایک برین گن اٹھائی اور گولیاں برسائے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں خون تھا اور وہ اندھا ہو رہا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح نکل گئی اور اب میں اس کمرے میں پہنچی ہوئی گولیوں کی آوازیں سن رہی ہوں۔ خدا کے لئے جلد پہنچنے۔“

”اچھا لڑکی۔“ فریدی ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”چپ چاپ پڑی رہو۔ میں آ رہا

ہوں۔“ وہ ریسورر رکھ کر جانے کے لئے مڑا۔

ڈی۔ آئی۔ جی وغیرہ بھی اسی کمرے میں آگئے تھے۔

”کیسے جاؤ گے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”جس طرح بھی بن پڑے گا۔ جانا تو ہے ہی۔ وہ تباہ اور ایک مشین کے ذریعہ ان

بندوقوں کو کٹرول کر رہا ہے۔“

”نہیں.... اس حالت میں.... بھلا میں کیسے جانے دوں گا۔ اب میرے خیال سے اسے

تھکنے ہی دو۔ لوگ ہوشیار ہو گئے ہیں اور اب کسی کے مرنے کا امکان نہیں۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”وہاں ایک زندگی خطرے میں ہے۔ ایک ایسی لڑکی جس سے ہمیں تھوڑی بہت مدد بھی ملی

ہے۔ میں اُسے اس کے رحم و کرم پر کسی طرح نہیں چھوڑ سکتا۔“

”پاگل نہ بنو۔“ ڈی۔ آئی۔ جی اس کا بازو پکڑتا ہوا بولا۔

”میں آپ کا حکم نہ ماننے پر مجبور ہوں۔“ فریدی نے پلٹ کر اُسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ ڈی۔ آئی۔ جی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کسی پاگل کی ویران آنکھیں رہی ہوں۔ بے حس اور خوفناک۔ فریدی ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھا۔ لیکن ایس۔ پی دروازے میں حائل ہو گیا تھا۔

”براہ کرم ہٹ جائیے۔ وہاں تک پہنچنا کچھ مشکل کام نہیں۔ تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کس کمرے میں ہے۔ عمارت میری دیکھی ہوئی ہے۔ وہ بس اندھوں اور پاگلوں کی طرح گولیاں برسا رہا ہے۔“

”لیکن جاؤ گے کس طرح۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بے چینی سے ہوا۔

”وہ سارے مل دو دو فٹ کے فاصلے پر لگے ہوئے ہیں۔ اگر میں کسی دونوں کے درمیانی فاصلے کو ذہن میں رکھ کر چلوں تو گولیوں سے بچ سکتا ہوں۔“

”خطرناک! انتہائی خطرناک.... ہرگز نہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی چیخ کر ہوا۔

لیکن اتنی دیر میں فریدی ایس۔ پی کو دھکا دے کر باہر نکل چکا تھا۔

”پکڑو.... اسے پکڑو.... پاگل.... سور۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بے تابانہ اس کے پیچھے دوڑا لیکن

فریدی گلی میں بھرے ہوئے آدمیوں کی بھیڑ میں غائب ہو چکا تھا۔

وہ اوگ پھر کھڑکیوں کے قریب آگئے اور پھر انہوں نے فریدی کو نیچے فٹ پاتھ پر دیکھا۔ اُس سے تھوڑے ہی فاصلے پر گولیاں گر کر گرد و خرابا رہی تھیں۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے اوپر سے اُسے پھر آواز دی لیکن اس نے سر اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس کی نظریں پائپ پر جمی ہوئی تھیں اور پھر وہ چل پڑا اوگ پیچھے لگے۔ پھر اس نے اتنی تیزی سے سڑک پار کی جیسے بجلی چمک گئی ہو۔ دوسرے فٹ پاتھ پر پہنچ کر وہ مڑا اور ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف دیکھ کر ہاتھ بلانے لگا۔

”ہے کوئی اس کی ٹکر کا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی ہنس پڑا۔ یہ ہنسی ٹیپ فٹیم کی تھی۔ کچھ گلوگے سی جس میں شاید کچھ آنسوؤں کی نمی بھی شامل تھی۔ حقیقتاً اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

”زندہ باد بیٹے! زندہ باد۔“ وہ ہاتھ مل کر بڑبڑایا۔

فریدی نے نچلے سارے دروازوں پر نظریں دوڑائیں لیکن سب کے سب بند تھے۔ تیسری منزل کی ایک کھڑکی کھلی نظر آرہی تھی اور اسی سے ملا ہوا ایک مونا سا پائپ تھا جو نیچے تک چلا آیا

تھا۔ فریدی نے اپنے جوتے اتارے کوٹ کی جیب سے ریو اور نکال کر پتلون کی جیب میں ڈالا اور کوٹ بھی اتار کر وہیں فٹ پاتھ پر پھینکا۔ اب وہ اسی پائپ کو پکڑ کر اوپر چڑھ رہا تھا۔ اسے بد قسمتی ہی کہنا چاہئے کہ جب وہ اوپر پہنچ کر کھڑکی میں داخل ہو رہا تھا تو ریو اور اس کی جیب سے نکل کر نیچے فٹ پاتھ پر جا پڑا۔ فریدی نے جھٹک کر دیکھا اور پھر ہراساں بنا کر بڑبڑایا۔

”او نہ! جہنم میں جائے۔“

کمرہ خالی تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ پیروں میں جوتے نہیں تھے۔ اس لئے وہ کوئی آواز پیدا کئے بغیر یہ آسانی نقل و حرکت کر رہا تھا۔

نمارت کا پورا نقشہ اس کے ذہن میں تھا۔ وہ دوسری منزل پر اتر آیا۔ مشین گنیں اب تک چل رہی تھیں۔ الٹے پیری کے قریب پہنچ کر وہ ایک لحظہ کے لئے رکا پھر آہستہ آہستہ اس کمرے کی طرف بڑھا جس کا پتہ کنول نے دیا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نارنگ کی پشت دروازے کی طرف تھی اور وہ مجنونانہ انداز میں ایک سپنے کو تیزی سے گھمائے جا رہا تھا۔ فریدی پنچوں کے بل چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور پھر یگانہ ڈاکٹر نارنگ پر ٹوٹ پڑا۔ ڈاکٹر نارنگ کسی زخمی سانپ کی طرح پلٹا اور پیہر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ دونوں کہتے گئے تھے۔ ڈاکٹر نارنگ کسی پاگل کتے کی طرح فریدی کو بھنبھوڑ رہا تھا۔ ایک تو ایسے ہی کافی طاقتور تھا اور پھر اس وقت کا کیا پوچھا دوسرے ہی لئے فریدی کی قوت جواب دینے لگی۔ گولیوں کی آواز بند ہو گئی تھیں۔ فریدی نے اپنی پوری قوت سے نارنگ کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

”خبردار نارنگ۔“ دفعتاً دروازے کی طرف سے ایک نسوانی آواز آئی۔ ”الگ بیٹو ورنہ گولی مار دوں گی۔“

کنول دروازے میں ریو اور لئے کھڑی تھی۔ نارنگ کے حلق سے ٹیپ طرح کی ڈر اوونی آواز نکلی اور فریدی کو بس اتنا محسوس ہو۔ کا جیسے وہ بھی نارنگ ہی سے پلٹا ہوا کوئی فٹ اچھل گیا ہو۔ پھر اس نے کنول کی گھنٹی گھنٹی سی چیخ سنی۔ نارنگ ایک ہاتھ سے فریدی سے نیٹ رہا تھا اور دوسرے سے اس نے کنول کو دبوچ رکھا تھا۔ کنول کے ہاتھ سے ریو اور نکل کر دور جا پڑا۔ وہ کنول کو بُری طرح دبا رہا تھا اور کنول کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ فریدی نے بائیں ہاتھ سے ڈاکٹر نارنگ کی ناک دبا کر ایک زوردار جھٹکا دیا اور اس کا سر اس کی

ہائیں بغل کے نیچے آگیا۔ فریدی کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ دانت ہاتھ سے وہ کنول کو الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے جھٹکا کر نارنگ کی گدی پر ایک گھونسلہ رسید کر دیا۔ اس نے کنول کو چھوڑ دیا اور وہ بے جان سی فرش پر آ رہی۔ ڈاکٹر نارنگ فریدی کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ فریدی کا دوسرا گھونسلہ اس کے پیٹ پر پڑا اور وہ ہلکا کر دوہا ہو گیا۔ اس کا سر فریدی کی گرفت سے نکل گیا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ سنبھلتا تیسرا گھونسلہ اس کی ناک پر پڑا اور وہ کسی مرتے ہوئے بھینسے کی طرح ڈکرا کر چیت ہو گیا۔

دوسرے لمبے میں فریدی اس کے سینے پر سوار تھا اور اس کے نہ رکنے والے ہاتھ نارنگ کے چہرے پر گھونسلوں کی بارش کر رہے تھے۔

پولیس آگئی۔ ڈی۔ آئی۔ جی ساتھ تھا۔ فریدی نارنگ کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ نارنگ بے ہوش تھا۔ فریدی کسی شرابی کی طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ قمیض تار تار ہو گئی تھی۔ بال بکھرے تھے۔ چہرے پر کئی جگہ سے خون رس رہا تھا۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے اسے سہارا دینا چاہا لیکن وہ جھپٹ کر کنول کے پاس پہنچا جو بے حس و حرکت فرش پر پڑی ہوئی تھی۔

”یہ ابھی زندہ ہے۔“ فریدی پاگلوں کی طرح حلق پھاڑ کر چیخا۔ ”جلدی کرو۔ اسے ہسپتال لے جاؤ۔ جلدی.... نبض کمزور چل رہی ہے۔“

بے ہوش نارنگ کے ہتھکڑیاں اکا دی گئیں۔ اسے اٹھانے سے پہلے کنول کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ فریدی نے فاتحانہ انداز سے نارنگ کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی جو اسی کے چہرے سے بنے ہوئے خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی اسے سہارا دینے ہوئے اپنے رومال سے اس کے چہرے کا خون خشک کر رہا تھا۔

”اسے ہسپتال بھجوا دیا۔“ فریدی نے آہستہ سے پوچھا۔

”ہاں! ہاں.... تم مطمئن رہو۔ سب ٹھیک ہو رہا ہے۔“

”ورنہ۔“ فریدی نے نارنگ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اور ایک ہاتھ سے بھی زیادہ طاقتور! پتہ نہیں اور کون کون سی حیوانی قوتیں رکھتا ہے۔ ایک زہریلے سانپ کی طرح پھونانیز بھی کر سکتا ہے۔ کرمل کی بہن کو اس نے مینا زخم ہی کے اثر میں لے رکھا تھا اور وہ رانگل بھی یہیں کہیں ہوگی۔ وہ بے چاری لڑکی.... ان کی لاش بھی یہیں کہیں ہوگی۔“

”اچھا اب تم چلو یہاں سے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بولا۔

”اوپری منزل پر کچھ لاشیں ضرور ہوں گی۔“

”اوہ.... چھوڑو.... سب دیکھ لیا جائے گا.... چلو۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے اُسے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”مگر نہیں پچھلی طرف سے چلیں گے۔ سڑک پر مجمع تمہیں اور مجھ کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہے۔“

وہ دونوں پچھلے دروازے سے نکل کر دوسری سڑک پر پہنچے۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے ایک سب انسپکٹر سے کارا لانے کے لئے کہا۔

”میں شاید نگے پیر ہوں۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”اور میرے جسم پر جیتھڑے ہیں۔“

”مجھے افسوس ہے کہ تمہارا کوٹ اور جوتے نہ جانے کہاں ہوں گے۔ ریو اور تو اٹھا لیا گیا تھا لیکن اُن کی طرف دھیان نہیں گیا۔“

اس سڑک اور سائبر مینشن سے ایک سو پچیس لاشیں اٹھائی گئیں۔ شہر میں ایک بار پھر خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ لوگوں کو اس کی خوشی تو ضرور تھی کہ ایک اتنا خوفناک مجرم گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی وہ دل گرفتہ بھی تھے کہ ایک دن میں ایک سو پچیس جانیں چلی گئیں۔ زیادہ تر لوگوں نے پہلے اسے افواہ ہی تصور کیا کہ مسٹر کیو ڈاکٹر نارنگ تھا۔ لیکن پھر یقین تو کرنا ہی پڑا۔ سرجنٹ حمید اور ناٹرنے طاووت جیٹی اور ناد رہ کی لاشیں شناخت کیں۔

مسٹر کیو عدالت میں

محکمہ سرائے سانی کا ہال کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ شہر کے سارے بڑے حکام موجود تھے۔ انور اور رشیدہ کو پہلی صف میں جگہ ملی تھی۔ سرجنٹ حمید ناک بھوں چڑھائے پھنپھناتا پھرتا تھا۔ فریدی کی تقریر کے دوران میں ایک مرتبہ بھی اس نے ہال میں قدم رکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ کیس کی تمہید کے بعد فریدی ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر مجمع پر ایک اچھتی سی نظر ڈال کر بولا۔

”ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مسٹر کیو کی شخصیت بڑے عجیب طریقے پر پردہ راز میں تھی۔ مجھے پہلے ہی سے علم تھا کہ سیکرٹ سروس کے پانچ آدمی اس نام کو استعمال کر رہے ہیں۔ میں ان کے ٹھکانے سے واقف نہیں تھا۔ لیکن اس اطلاع کے بعد اُن کے متعلق چھان بین کرنا ضروری

بُجو گیا۔ بہر حال منتظر آیا کہ میں نے ان کے ٹھکانے کا پتہ تو اگالیا لیکن نہ تو ان کے ٹرانسمیٹر کا سراغ ملا اور نہ خود ان کا۔ کافی غور و خوص کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ انہیں شاید بحرِ موموں نے ختم ہی کر دیا۔ لیکن سیکرٹ سروس کا ہیڈ کوارٹر برابر یہی کہے جا رہا تھا کہ وہ نہ صرف موجود ہیں بلکہ اپنی تختیاں بھی لے رہے ہیں۔ بات عجیب تھی۔ مگر میں اپنے ہی نظریے پر جمارا۔ آخر آج ڈاکٹر نارنگ نے اس بات کا اعتراف کر ہی لیا کہ اس نے ان پانچوں کو ختم کر کے ان کی چیزوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایک طرف وہ انہیں اپنے جرائم کا بھی آلہ کار بناتا رہا اور دوسری طرف سیکرٹ سروس کے ہیڈ کوارٹر سے بھی رابطہ قائم رکھا حتیٰ کہ ان پانچوں کی تختیاں تک حاصل کر تا رہا۔ اس طرح وہ حکومت کے اہم رازوں میں بھی دخیل ہوتا گیا۔

”لیکن اس کا مقصد کیا تھا....؟“ کسی نے سوال کیا۔

”مقصد.... اس نے اپنے خلاف اگائے ہوئے الزامات کا اعتراف کر لیا ہے لیکن.... مقصد کے متعلق کہتا ہے کہ اس کا اظہار عدالت ہی میں کرے گا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ ڈی۔ آئی۔ جی نے بے چینی سے پوچھا۔

”میرا خیال! میرا خیال یہ ہے کہ ان کے سارے جرائم کے پس منظر میں کوئی اہم تنظیم نہیں تھی۔ اگر اس نے انتظار حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا تھا تو میدانِ سیاست کے بہترین کھلاڑیوں کو اپنے بس میں کرنے کی کوشش کرتا لیکن اس کے برعکس اس کے آدمیوں میں سبھی قانون کے مجرم نظر آتے ہیں۔ معمولی چور اچکے، قاتل، سازشی اور قانوناً ناجائز اشیاء کی تجارت کرنے والے۔ بہر حال میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ سب کچھ محض دہشت اور انتشار پھیلانے کے لئے تھا اور وہ بھی قذافی کا مقصد! میں اسے ایک طرح کا جنون ہی سمجھنے پر مجبور ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ ڈاکٹر نارنگ کسی خطرناک کو مہلکس کا شکار ہے۔“

”خیر یہ بات بھی کھل ہی جائے گی۔ تم اپنا بیان جاری رکھو۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔

”اس کے ساتھ ساتھ ناگہر کی مصنوعی خودکشی کے متعلق تو بتائی چکا ہوں۔ اگر ایسا نہ کرتا تو ڈاکٹر نارنگ اسے کی حال میں بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ اس کا طریقہ شروع ہی سے یہ رہا ہے کہ اگر وہ اپنے کسی ساتھی کے متعلق یہ محسوس کر لیتا تھا کہ وہ پولیس کے ہتھے چڑھ جائے گا تو وہ اسے زندہ ہی نہیں چھوڑتا تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ مسئلہ کیونام بھی پردہ رازی میں رہے۔ بہر حال میری

احتیاط سے اتنا تو ہوا کہ ناکر بچ گیا۔ لیکن مسٹر کیو کو اس کی خودکشی پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس لئے اس نے خود ہی اپنا نام اپنے ہی ذریعہ سے ظاہر کر دیا۔ اس میں بھی اس کی ایک گہری چال تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ خود ہر طرح کے شبہات سے بالاتر رہے۔ چونکہ سب سے پہلے اس کا وہی بنگلہ محکمہ سرانگ رسائی کے ایک فرد سر جنت حمید کو مشتبہ معلوم ہوا تھا اس لئے اس نے ہر طرح سے اپنی صفائی ضروری سمجھی اور میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ اگر حمید کو اس بنگلہ میں وہ حادثہ نہ پیش آیا ہو تا تو ہم آج بھی ان سارے جرائم کی روح رواں سے ناواقف ہوتے۔ ڈاکٹر نارنگ نے اپنے ساتھیوں کی اس حماقت پر پردہ ڈالنے کے لئے اتنے پاپڑ بیلے کہ اس سے غلطیاں ہی سرزد ہوتی چلی گئیں اور نتیجے کے طور پر اسے قانون کی گرفت میں آ جانا پڑا۔۔۔۔۔ ہاں تو۔۔۔۔۔ کرمل فریڈ کے سیکریٹری ساجد اور نارنگ کے ساتھی ناگر کے بیان سے مجھے اس کے طریقہ کار کا علم ہوا۔ جو بڑا عجیب تھا۔ وہ ایسے مجرموں کو بلیک میل کر کے اپنے گروہ میں شامل کر لیتا تھا جن کے جرائم سے پولیس بھی لاعلم ہوتی تھی اور اس کے لئے وہ سیکرٹ سروس والوں کا ٹرانسمیٹر استعمال کرتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے ساتھیوں کے لئے بھی معمد بنا ہوا تھا۔ اس نے یہ چیز بھی ان کے ذہن نشین کرا دی تھی کہ اگر ان میں سے کسی نے کبھی مسٹر کیو کی شخصیت کا راز معلوم کرنے کی کوشش کی تو ختم کر دیا جائے گا اور اس نے کئی آدمیوں کے ساتھ یہی برتاؤ بھی کیا۔ سرف ساجد ہی ایسا تھا جو بچ گیا۔ وہ بھی اگر پائل خانے کی راہ نہ لیتا تو اس کی زندگی بھی ناممکن تھی۔“

”بھئی۔۔۔۔۔ وہ جعفری والا واقعہ۔“ ذی۔ آئی۔ جی مضطربانہ انداز میں ہوا۔

”اسی کی طرف آرہا ہوں۔“ فریدی نے مسکراتے ہوئے تقریر جاری رکھی۔ جب مجھ پر اور حمید پر حملہ ہوا تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ روپوش ہو جائیں۔ مجھ سے دراصل ایک زبردست غلطی ہوئی تھی۔ اس مائیکروفون والے واقعے میں مجھے بھی رازداری ہی برتنی چاہئے تھی۔ بہر حال مجھ پر وہ حملہ ڈاکٹر نارنگ کی جماعت ہی کا نتیجہ تھا۔ اس طرح میں نے اس کا ایک منیر العقول حربہ قطعی بیکار کر دیا تھا۔“

”وہ اڑنے والی رائفل کہاں ہے۔“ متعدد آوازیں آئیں۔

”ابھی تک نہیں برآمد ہو سکی۔ ڈاکٹر نارنگ نے ابھی تک اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ بہر حال میں اپنی روپوشی کے لئے کسی اچھی سی جگہ کی تلاش میں تھا اسی دوران میں میں نے فیصلہ

کیا کہ ایسی صورت میں کسی ایک جگہ رہنا ٹھیک نہیں تھا ابھی میں شہر ہی تک محدود تھا کہ ساجد اور ناگ کے تجربات کا علم ہوا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسٹر کیو پر ہاتھ ڈالنے کا ایک طریقہ ہو سکتا ہے کہ میں بھی مجرموں کا رول ادا کر کے اس تک پہنچوں۔ چھ ایسے جرائم گروں جو مسٹر کیو کو اپنی طرف متوجہ کر لیں اور وہ مجھے بھی ہلکے میل کر کے اپنے گروہ میں شامل ہونے پر مجبور کرے۔ میں اسی اڈیٹر بنی میں مصروف ایک شام راجروپ نگر کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں ایک الٹی ہوئی کار پر نظر پڑی۔ وہ غالباً ایک درخت سے ٹکرا کر الٹی تھی۔ وہ سڑک عموماً ویران ہی رہتی ہے۔ اس لئے شاید ابھی تک کسی نے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ بہر حال اس کار میں مجھے جیمس اینڈ جعفری کا جنرل منیجر جعفری دکھائی دیا جو بہت زیادہ زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ بس اسی وقت اچانک میری اسکیم مرتب ہو گئی۔ جعفری دیکھنے میں خاصا ذراؤنا معلوم ہوتا ہے اور کچھ خبطی سا بھی ہے۔ شہر میں نہیں رہتا۔ دیہاتوں اور غیر آباد مقامات پر اس نے چھوٹے چھوٹے مکانات بنوا رکھے ہیں۔ انہیں میں اس کا قیام رہتا ہے۔ میری اس کی یونہی رسمی ملاقات تھی۔ میں نے سوچا اس سے کام لینا زیادہ مناسب رہے گا۔ میں نے اسے الٹی ہوئی کار سے نکال کر اپنی گاڑی میں ڈالا اور راجروپ نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں میں نے جعفری کو اپنے ایک دوست ڈاکٹر شوکت کے سپرد کیا اور اسے ساری باتیں سمجھا دیں۔ مجھے توقع بھی تھی کہ جعفری کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا اور یہی ہوا۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹر شوکت ہی کا مہمان رہا۔ بہر حال اس کے دفتر میں کسی کو میرے متعلق ذرہ برابر بھی شبہ نہ ہوا اور کوئی دھیان ہی کیوں دیتا۔ دفتر والے تو اس سے لرزتے ہی رہتے تھے۔۔۔۔۔ پھر میں نے رشیدہ کو اس کے دفتر میں جگہ دی۔ شروع ہی سے ارادہ تھا کہ اپنے جرائم کا ذریعہ رشیدہ ہی کو بناؤں گا۔ اسے اس کا ذرہ برابر بھی علم نہ تھا کہ وہ فریدی جس نے اسے وہاں ملازمت کرنے کی ترغیب دی ہے۔ خود ہی جعفری بھی ہے۔ اس طرح اس کے دل میں بناوٹ نہیں ہونے پائی۔۔۔۔۔ جس دن دفتر کی تلاشی ہوئی اسی دن میرا نام مسٹر کیو کی لسٹ میں آ گیا۔ اس کے آدمی میرے متعلق اور زیادہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔۔۔۔۔ اس کے گروہ کی ایک لڑکی کنول نے اس کا پیہ اگایا تھا کہ اس تلاشی میں رشیدہ ہی کا ہاتھ تھا۔ بہر حال میں رشیدہ کو لے اڑا۔ مسٹر کیو کا کوئی آدمی میری کار کا تعاقب کر رہا تھا میں نے اس کا ایک نام پھاڑ دیا۔ محض اسے یہ باور کرانے کے لئے کہ

میں اُسے پولیس کا کوئی آدمی سمجھا ہوں۔ جس مکان میں رشیدہ کو لے گیا تھا وہ جعفری ہی کا ہے اور ایک غیر آباد مقام پر واقع ہے۔ میں نے کئی دنوں سے وہیں بود و باش اختیار کر رکھی تھی اور برابر یہ محسوس کرتا رہا تھا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ لیکن میں بظاہر بے پروا نظر آتا رہا۔۔۔ ہاں تو جب میں رشیدہ کو باندھ رہا تھا تو ہم پر ایک تیز قسم کی روشنی پڑی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کسی فلیش کیمرے کی ہے۔ اس پر میں نے چیخ چلا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی پولیس والے کی حرکت تھی۔ میں نے عدا رشیدہ سے ساری انگٹلو اونچی آواز میں کی تھی۔ لیکن اب یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اسے مسٹر کیو کے آدمی نہ اٹھالے جائیں۔ کیونکہ انہیں کسی ایسے آدمی کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو فریدی کا پتہ اور نشان جانتا ہو۔۔۔ دوسرے دن صبح ہی میں نے رشیدہ کو بے ہوش کر کے ایک ٹرک میں ڈالا اور اس کے اوپر پیالہ لاد دیا۔ اس طرح اسے بھی راجڑو پنگر پہنچایا اس وقت میں جعفری کی شکل میں نہیں تھا۔ نگرانی کرنے والے اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس لئے میدان صاف تھا۔۔۔ دوسرے دن آفس میں مجھے وہی تصویر ملی جو میں نے بعد میں انور کو بھیج دی تھی۔ تصویر کے ساتھ ہی مسٹر کیو کا ایک دھمکی آمیز خط بھی تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اگر میں اس کے گروہ میں نہ شامل ہوں اور اس کے احکامات کی تعمیل نہ کی تو وہ تصویر پولیس کے حوالے کر دی جائے گی۔ میرا جواب اس نے ایک ویران جگہ پر مانگا تھا۔ میں نے جواب لکھ کر وہاں رکھ دیا۔ خط و کتابت جاری رہی۔ جس کے ذریعہ اس نے مجھے کئی جرائم کی ترغیب دی۔ بہر حال میں پیغام رسانی کے طریقے کار از جاننے کا کوشاں رہا۔ پھر مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس کے خطوط کئی ہاتھوں سے گزرتے ہوئے مجھ تک پہنچتے ہیں۔ اسی طرح وہ خط بھی کئی ہاتھوں سے گزرتا ہوا سائبر مینشن تک پہنچا تھا اور پھر وہاں سے اسے کوئی نامہ بر کیوٹر ڈاکٹر نارنگ تک پہنچا دیتا تھا اور ڈاکٹر نارنگ کا نام پکارتا ہوا خط کیوٹر ہی کے ذریعے سائبر مینشن تک پہنچتا تھا۔ مجھے کئی دنوں تک ان کیوٹروں کا تعاقب کرنا پڑا تب جا کر یہ راز کھلا کہ وہ ڈاکٹر نارنگ کی کونھی پر اترتے ہیں۔ پھر میں نے اپنی کئی راتیں چوروں کی طرح سائبر مینشن اور نارنگ کی کونھی کی تلاشی لینے میں صرف کیں اور جب مکمل طور پر اس بات کا یقین ہو گیا کہ اصل مجرم نارنگ ہی ہے تو میں نے وہ تصویر انور کو بھیج دی۔ جب جعفری کے دفتر کی تلاشی ہو رہی تھی تو اس وقت میں سڑک ہی پر موجود تھا۔ لیکن دوسرے بھیس میں۔ ڈی۔ آئی۔ جی کی واپسی پر میں نے انہیں ڈانٹ

نارنگ کی طرف سے فون کیا.... اور پھر جو کچھ بھی ہوا آپ جانتے ہی ہیں۔“

تمام واقعات صاف ہو چکے تھے لیکن لوگ نارنگ کا بیان سننے کے لئے بے تاب تھے۔ جس دن عدالت میں ڈاکٹر نارنگ کا بیان ہونے والا تھا کہیں تل رنٹس کی بھی جگہ نہیں تھی۔ صرف خواص ہی کا داخلہ ہو۔ کا تھا۔ عوام سڑک پر اور عدالت کے صحن میں بھرتے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نارنگ نے بڑی شرافت سے استدعا کی تھی کہ باہر والوں تک اس کی آواز پہنچنے کے لئے مائیکروفون کا انتظام کیا جائے۔ پہلے اس کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی لیکن جب اس نے اس بات کا یقین دلایا کہ ملک کے مفاد کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہے گا تو درخواست منظور کر لی گئی اس نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ کوئی ایسی بات شروع کرے تو مائیکروفون کا سلسلہ منقطع بھی کیا جاسکتا ہے.... بڑی عجیب درخواست تھی۔

نارنگ قیدیوں کے کپڑے پہنے ہوئے کٹہرے میں بیٹھا تھا۔ لیکن یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ تندرست نظر آ رہا تھا۔ چہرہ سرخ تھا اور آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک نظر آرہی تھی۔ جب وہ اپنا بیان دینے کے لئے کھڑا ہوا تو عدالت میں سنا نا چھا گیا۔ پھر حلف دینے کی رسم شروع ہونے والی تھی کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”کسی موبوہم ہستی کو درمیان میں لانے کی ضرورت نہیں میں جو کچھ بھی کہوں گا سچ ہی کہوں گا۔ البتہ میں جتے ہوئے خون کی قسم کھا سکتا ہوں۔ کیونکہ خون ریزی ہی میرا مذہب رہا ہے۔ لوگ میرے جرائم کا مقصد جاننے کے لئے بے تاب ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جو مقصد کسی مذہب کا ہو سکتا ہے وہی میری خونریزی کا بھی تھا۔ مذہب انفرادی اور اجتماعی سکون کا ذریعہ ہے اور میں صرف انفرادیت میں یقین رکھتا ہوں محض اس لئے کہ اجتماعی زندگی نے مجھے حرامی قرار دیا تھا۔

حرامی! ہاں میں حرامی ہوں.... میری سنجیدگی پر کئی منہ حیرت سے کھل گئے ہیں۔ کچھ مسکرا بھی رہے ہیں اور آنریبل چیف جسٹس یہ سوچ رہے ہیں کہ شاید اب میں پاگل پن کا ڈھونگ رچانے جا رہا ہوں۔ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالوں گا اور پھر اس وقت تک پھانسی سے بچا رہوں گا جب تک مجھے پاگل خانے میں قیام کرنا پڑے گا.... نہیں میں باہوش و خواص کہہ رہا ہوں کہ میں حرامی ہوں۔ میں اپنی ماں کی شادی کے ٹھیک پانچویں مہینے میں پیدا ہوا تھا۔ اس سانسے پر اس نے تو خودکشی کر لی تھی لیکن وہ شخص جس سے اس کی شادی ہوئی تھی.... میں اس کا تذکرہ اتنے عامیانہ

انداز میں کر کے اس کی توہین کر رہا ہوں۔۔۔ وہ دنیا کا عظیم ترین شخص تھا میں تو اسے خدا تک کہنے کے لئے تیار ہوں۔ اس نے مجھے اپنے بیٹے کی طرح پالا اور پھر دوسری شادی نہ کی۔۔۔ ہوش سنبھالنے پر مجھے یہ سمجھایا گیا کہ حرامی کہتے کسے ہیں۔۔۔ میری ماں کا شوہر اس پر جھنجھٹاتا اور اپنی بوئیاں نوچتا۔ گاؤں بھر سے اس نے دشمنی مول لے لی لیکن پھر بھی وہ میرے لئے دوسروں سے لڑتا رہا۔ عورتیں اپنے بچوں کو میرے ساتھ کھیلنے سے روکتی تھیں میں بچپن ہی سے بڑا حساس تھا۔ مجھ پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔ کچھ اور بڑا ہوا تو سوچنے کا کہ آخر حرامی ہونے میں میرا کیا کیا قصور ہے۔ میرے پالنے والے نے تنگ آکر مجھے شہر کے ایک ہوسٹل میں بھیج دیا۔ بچپن ہی سے ذہین تھا۔ لکھنے پڑھنے میں دل زیادہ لگتا تھا۔۔۔ میں تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن وہاں بھی مشکل سے ایک ہی سال سکون سے گزار پایا۔ دوسرے سال اسی ہوسٹل میں میرے گاؤں کے دو ایک لڑکے اور بھی آگئے۔ مجھے پھر وہی آوازیں سنائی دینے لگیں۔۔۔ ”ڈاکٹر نارنگ۔ ایک لحظہ کے لئے رکا۔ عدالت میں سنا نا چھایا گیا تھا۔ وہ چند لمبے لمبے کھنکھناتے ہوئے گھر سے نکلا۔“ مجھے بتاؤ میں کیا کرتا۔۔۔ مجھے جواب دو؟ اگر کوئی مادر زاد انگڑا ہو تو لوگوں کو اس سے ہمدردی ہوتی ہے۔ مادر زاد اندھے ہندوؤں میں سوردا اس اور مسلمانوں میں حافظ کہلاتے ہیں۔۔۔ لیکن میں۔۔۔ کیا میں بذات خود ایک بہت بڑی مجبوری۔۔۔ نہیں تھا، کیا میں ایک بیماری کی طرح نہیں پیدا ہوا تھا۔ اگر میں شاستر پڑھ لیتا تب بھی حرامی ہی رہتا۔ اگر قرآن بھی حفظ کر لیتا تو لوگ مجھے حافظ کہتے ہوئے بچکھلاتے۔ آخر کیوں! کیا میں بھی ایک انگڑا یا اندھے کی طرح اپنی پیدائش کے معاملے میں بے بس نہیں تھا۔۔۔ زانی اور زانیہ اگر تائب ہو جائیں تو خدا ان کے گناہ معاف کر دیتا ہے لیکن میں تمہارے خدا سے پوچھتا ہوں کہ آخر اس نے حرامی کو کیوں اپنے بندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔۔۔ وہ جس کا میں نطفہ ہوں وہ اگر تائب ہو کر مولوی یا پنڈت ہو گیا ہو گا تو لوگ اس کے قدم چوم رہے ہوں گے اور وہ بہشت یا سورگ کی آس لگائے بیٹھا ہو گا۔۔۔ لیکن۔۔۔ میں۔۔۔ میں کس طرح خود کو بدل سکتا ہوں۔ میں حرامی ہوں۔ کوئی عادت نہیں ہوں کہ بدل جاؤں۔۔۔ میں ماضی۔۔۔ حال۔۔۔ اور مستقبل تینوں سے محروم ہوں۔ حال محض اس لئے کامیاب رہا کہ میں خود کو چھپانے میں کامیاب ہو گیا۔ اگر واقعی کوئی دوسری زندگی بھی ہے تو۔۔۔ میں اس سے بھی مایوس ہوں کیونکہ بعض مذاہب حرامی کو بہ حال میں جہنمی قرار دیتے ہیں

کے دوران میں میں نے کئی بار عدالت کی توہین کی ہے۔ اس لئے پھانسی کے ساتھ توہین عدالت کے سلسلے میں چھ ماہ کی سزا ضرور رکھی گئی ہوگی۔ لہذا میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ پھانسی کے بعد ہی مجھے چھ ماہ کی سزائے قید دی جائے۔“

حاضرین کے قہقہے کسی طرح رک نہ سکے۔

عدالت نے پھر میز پر مونگری بھائی شروع کر دی۔

عدالت درخواست ہونے پر فریدی بہت زیادہ شہیدہ نظر آ رہا تھا۔ حمید کے چھیڑنے پر

آہستہ سے بولا۔

”اگر یہ غلط راستے پر نہ نکل گیا ہوتا تو بڑا عظیم آدمی ہوتا۔“

”او نہہہ.....!“ حمید نے برا سامنہ بنایا۔ ”کنول کا کیا رہا۔“

”وہ اور ناگرسر کاری گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے ہیں! ظاہر ہے کہ بری ہو جائیں گے۔“

”وہ رانگل نہ جانے کیا ہوئی۔“

”کیا تم کچھلی کاروائیوں کے دوران سوتے رہے ہو۔ اُس نے اسے اسی وقت تباہ کر دیا تھا جب

میں نے مانیکرو فون کے امتناع کے لئے آرڈر نکلوائے تھے۔“

ڈاکٹر نارنگ کی پھانسی کا منظر بھی عجیب تھا جنہوں نے اسے اس وقت دیکھا تھا ان کا بیان ہے

کہ وہ گوشت و پوست کا آدمی تو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف یا انزعاج کی جگہ

شگفتگی تھی۔ جب اس سے اس کی آخری خواہش پوچھی گئی تو مسکرا کر بولا۔ ”پوچھنے سے کیا فائدہ

جبکہ پوری ہی نہ کی جاسکے۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ جتنے بھی موجود ہیں انہیں

بڑے بے دردی سے قتل کر دوں۔ آخری خواہش پوچھنے کا دھکوسلہ بھی ٹیب ہے! اچھا خیر چلو!

اگر پوچھنا ہی ہے تو ایک بڑی معمولی سی خواہش پوری کر دو۔ میرے مرنے سے پہلے یہی کہہ دو کہ

ڈاکٹر نارنگ حرامی نہیں ہے۔“

وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے کھڑا اس بُت کو دیکھتا رہا جسے گویا سانپ سونکھ کر دیا تھا۔ پھر اس

نے ایک زہریلا سا قہقہہ اگایا اور بالاتکان پھانسی کے تختے پر چڑھ گیا۔

ختم شد